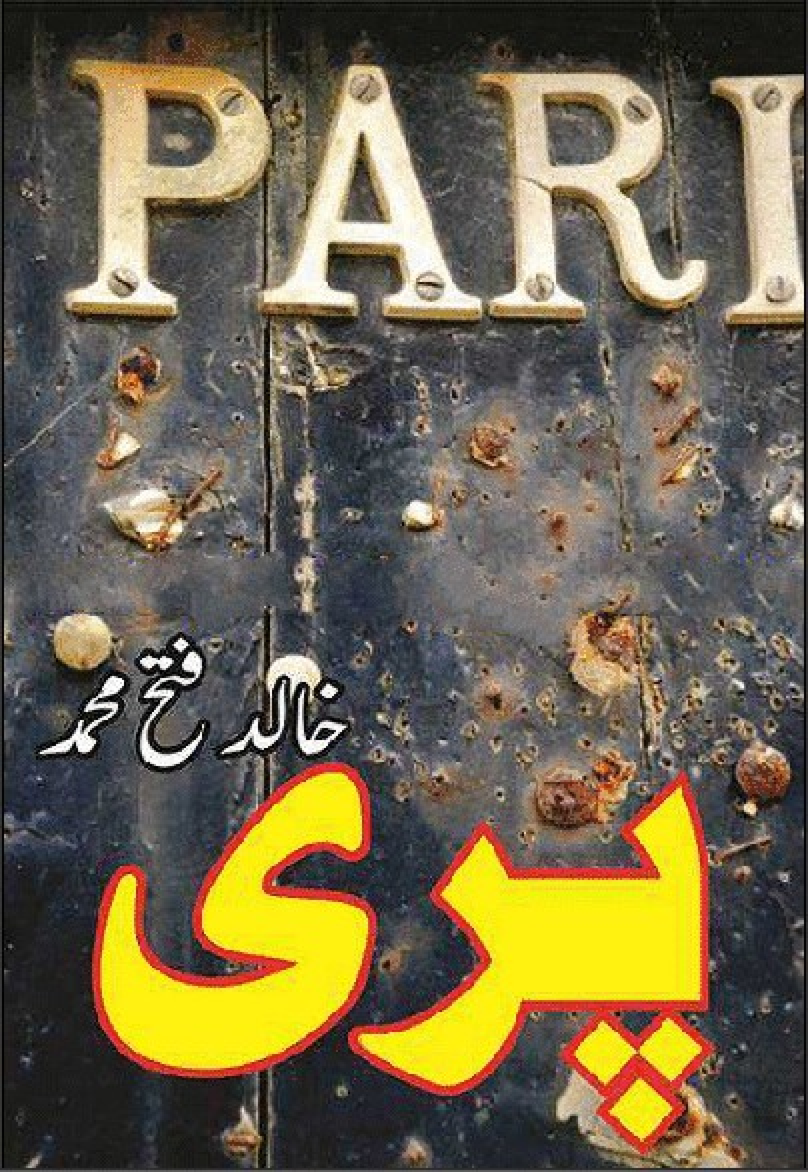

خالد فتح محمد

پری

مصنّف کی دیگر کتب

داغ داغ اُجالا (افسانے)
جمع تقسیم (افسانے)
پانچ منٹ کی زندگی (افسانے)
گلِ داوٗدی (غیر ملکی افسانوں کے تراجم، زیرِ طبع)

حمیدی

پری

خالد فتح محمد

برائٹ بُکس
پبلشر: امپوٹرز اینڈ بکسیلرز
8-B اقراء سینٹر غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 7226406

نام کتاب : پری
مصنف : خالد فتح محمد
ناشر : اے۔ ایم شکوری
اشاعت اوّل : فروری 2006
ٹائٹل : ریاظ احمد (0333-4349801)
پرنٹر : موسیٰ کاظم پرنٹرز لاہور
042-7116254

قیمت : 120 روپے

حمیدی

شکیلہ کے نام

I

میں نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

یہ نہیں کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے سراپے میں ایسی پاکیزگی تھی کہ اُس کی پرستش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ گول چہرے پہ بہت خوبصورتی سے سجی ہوئی شفاف آنکھیں جیسے پھول کی پتی پہ شبنم کے دو قطرے، گھنی اور لمبی زلفیں، نازک گردن جس پہ چہرہ، سر اور زلفیں ایک نفیس توازن بنائے ہوئے تھیں۔ بھرا بھرا جسم کہ کہیں اگر ایک سینٹی میٹر کا ہزارواں حصہ بھی زیادہ ہو تو غیر متناسب نظر آئے۔ مختصراً ہر نقش اُس پہ سج رہا تھا یا اُس کی خوبصورتی جسم کے ایک ایک حصے میں رچی ہوئی تھی......

اُس کا نام تو زہرہ جبین تھا لیکن میں اُسے پری کہتا۔

بہت عرصہ میں نے اُسے اس لیے نہیں چھوا تھا کہ کہیں اُس میں سے وہ عورت نہ نکل آئے جو سرابِ خیال کو حقیقت کے بگولے سے اُڑا دیتی ہے۔

پری سے میری پہلی ملاقات اتفاق تھا۔

میں ایک کامیاب صنعت کار ہوں۔ میری مصنوعات ملک کے اندر اور باہر یکساں طور پر مقبول ہیں۔ میں ایک بڑی تنظیم کا سربراہ ہوں (میرے اس سلسلے میں کافی لوگ روزگار حاصل کر رہے ہیں۔ میں اُنہیں مفت تو نہیں کھلاتا، وہ اپنا ذہن اور محنت میرے مختلف منصوبوں میں لگاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اپنی وفاداری میرے دامن میں ڈالنے سے نہیں ہچکچاتے۔ مجھے اس

بات کا بخوبی احساس ہے کہ سرمایہ دار خودغرض ہوتا ہے۔ اُسے اپنی کامیابی اور سرمائے کے تحفظ سے غرض ہوتی ہے۔ وہ اپنے مفادات کو سلامت رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ میں بھی اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہوں۔ گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کیا اور نہ ہی کبھی نقصان اُٹھایا ہے۔ میری کامیابی کی وجہ یہ نہیں۔ میں نے کبھی کسی کا حق نہیں رکھا۔ جتنا کسی کا ہوتا ہے اُسے بس اُتنا ہی دیتا ہوں، کم نہ زیادہ۔

میرے ہاں لوگ دو نسلوں سے ملازم ہیں۔ دوسری نسل یقیناً اپنے پیش رووٗں سے بہتر درجہ پہ فائز ہے۔ اُن کے اس بلند مقام میں میری سدھاوٹ بھی شامل ہے۔ میں نے ہونہار لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح تربیت دی کہ وہ میرے ادارے کو مزید فعال بنا سکیں۔ میں نے اُنہیں کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ اُنہوں نے اپنی فراست اور محنت سے کسی اور کی تجوری بھرنی ہے۔ میری مراعات اُن کے گرد ایک ایسی فصیل تھیں جنہیں وہ کبھی پار نہ کر سکے۔ اس طرح میں دوسرے سرمایہ داروں سے مختلف ہوں۔ اس نظام کے مروجہ اصولوں کے مطابق میں بھی اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہوں لیکن میرا لائحہ عمل مختلف ہے۔ اسے اپنانے کے لیے کئی لوگوں نے کوشش کی مگر وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ اِس کی بنیادی وجہ اُن کی تنگ نظری تھی۔ وہ نئی سوچ کا پرانے طریقے سے انطباق کر رہے تھے، نتیجتاً ماتھیوسن تھیوری آف پاپولیشن ہم پر منطبق ہو گئی۔ وہ حسابی اور میں جیومیٹری کے ارتقا کے مطابق اوپر چلتا رہا۔

بات ہو رہی تھی پری کی۔

شفقت میری ذاتی سیکرٹری ہے۔ اُس کا باپ میرا فورمین تھا۔ شفقت میری تنظیم کی ایک اہم رکن ہے۔ نہایت مستعد اور حوصلہ مند۔ میں کام میں بدنظمی یا سستی برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے نظام میں کہیں کوئی خرابی نظر آئے تو میں شفقت کو ذمے دار ٹھہراتا ہوں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذمے داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوتی۔ میں جتنا وقت اپنے دفتر میں گزارتا تقریباً اُتنا ہی اپنے مخصوص شوق اور دلچسپیوں پر صرف کرتا۔ بعض اوقات کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے میری ضرورت ہوتی لیکن میں اُس وقت اپنے کسی ذاتی شغل میں اتنا غرق ہوتا کہ میرے

ساتھ رابطہ کرنا مشکل ہوتا، ایسے موقعوں پر شفقت اُسی طرح فیصلے کرتی جس طرح میں کرتا تھا۔ یہی میری کامیابی کی وجہ تھی۔

میرے ہاں ہر رکن اپنی جگہ معظم علی خاں تھا۔

اُس رات میں گھر پر دیر سے پہنچا۔ صبح اُٹھا تو سر میں درد تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر شب بیداریاں اس قسم کی اعضا شکنی کی وجہ بنتیں۔ میں دفتر ہمیشہ وقت پر پہنچتا ہوں۔ اپنے وسیع تجربے میں، میں نے کامیاب سربراہ کو وقت کا پابند دیکھا ہے۔ ایک تنظیم کے مختلف کل پرزوں کو صحیح سمت میں چالو رکھنے والا یہ موثر ترین Lubricant ہے۔ اگر میں نو بجے تک دفتر نہ پہنچوں تو شفقت میری معذوری سمجھ جاتی ہے۔ میرے کارندے کتنے ذمے دار ہیں، میں بخوبی سمجھتا ہوں۔ اگر میں دفتر میں نہیں تو ماحول قدرے تساہل پسندی کا ہوتا ہے۔ اِس کو میں بطور حکمتِ عملی تو نہیں لیکن ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتا ہوں۔

میرے دفتر میں دو اطراف سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی اہم ملاقات نہ ہو تو شفقت کا دفتر میری آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اُس روز میں معمول سے کافی دیر بعد پہنچا۔ میں اُس کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر ذرا گھبرائی۔ وہ پری کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ شفقت سراسیمہ سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پری بھی سیدھی ہو کے بیٹھ گئی اور میری طرف مڑی...... میں نے جب اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

میں اپنے دفتر جانے کے بجائے وہیں بیٹھ گیا۔ شفقت پریشان سی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُسے میرے ساتھ کام کرتے تین برس ہونے کو آئے تھے۔ لہجے میں اپنائیت تو دور کی بات تھی میں اُس کے ساتھ کبھی مسکرایا بھی نہیں تھا۔ ہمارا تعلق خالص دفتری، سربراہ اور ایک ماتحت کا تھا۔ میں نے اُسے اپنے دفتر میں کبھی بیٹھنے کو نہیں کہا تھا چاہے ہماری ملاقات کی طوالت گھنٹے بھر کی ہو۔ اُس کی ہچکچاہٹ، پریشانی یا سراسیمگی قدرتی تھی۔ میں کرسی کھینچ کر بیٹھا تو مجھے بھی قدرے جھجک محسوس ہوئی، لیکن کیا کرتا۔ پری میں کشش ہی ایسی تھی کہ میرا سالہا سال کا ضبط پانی کی طرح بہہ گیا۔ میں پری کے سامنے بیٹھا تو ہزار کوشش کے باوجود اُٹھ نہیں سکا۔

میری عمر اُنچاس کے پیٹے میں لگتی تھی۔ وہ میری بیٹی کی عمر کے برابر ہوسکتی تھی۔ میں اُس کا چچا، ماموں یا کوئی اور بزرگ ہوسکتا تھا۔ میری عمر اُس کا عاشق ہونے کی نہیں تھی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر کوئی عشق نہیں کرسکتا۔ اس جذبے کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ ان رنگوں میں سے ہر ایک کا اپنا عکس ہوتا ہے۔ آدمی جتنا کمزور ہوگا اُس کا جذبہ اُتنا ہی سطحی اور عارضی ہوگا۔ دراصل عشق ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ عاشق صحیح معنوں میں وہ ہے جو اس کی شدت کو محسوس اور برداشت کرسکے۔ ہمارا معاشرہ ایک بہت واضح جھجک کا شکار ہے۔ اس کا رُخ زیادہ تر شباب کی سمت ہے۔ یہاں عمروں کو خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ہر خانہ ایک مخصوص لباس کو رکھنے کے لیے ہے۔ بچپن میں ہم عزت کرنا سیکھتے ہیں۔ ہماری ہر ذہین اور معصوم شرارت کو بدتمیزی سمجھا جاتا ہے۔ آغاز شباب کا زمانہ سیکھنے کے لیے صرف ہونا چاہیے۔ شباب کا دور شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کا۔ میری عمر کاروبار کو مستحکم کرنے اور اولاد کو ذمے داریاں سونپنے کی ہے۔ آخری حصہ معافی اور موت کے انتظار کا۔ ان تمام خانوں میں عشق کے لیے ایک بھی محفوظ خانہ نہیں۔ عمر کے کسی حصے میں اگر کوئی اس خوش رنگی میں مبتلا ہوجائے تو سمجھو کہ اس کی عاقبت خراب ہوگئی۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے پری کو دیکھتے ہی عشق ہوگیا۔ میں اُسی وقت اس جذبے کی شدت کو محسوس کرسکتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پری میرے برابر بیٹھی بے چین تھی۔ وہ میرے شوق کو پڑھ گئی یا اُس کے احساس میں بھی کچھ پک رہا تھا۔

‘‘تینوں کے لیے کافی منگواؤ......تم کافی پیتی ہو؟’’ میں شفقت اور پھر پری سے مخاطب ہوا۔

شفقت نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا۔ پری نے نظر جھکا کے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم خاموشی سے بیٹھے رہے۔ یقیناً دونوں میری طرح اپنے خیالات کے جالوں میں الجھی ہوئیں تھیں۔ مجھے کچھ خدشات بھی تھے۔ پری کا اچانک مجھے پسند آجانا ایک حادثہ تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی بغیر سیٹ بیلٹ کے ہو اور Head-on collsion کے بعد زندہ بچ جانے کی صورت میں صدمے کی حالت سے نکل آئے۔ یہ دراصل اعصاب کی مضبوطی پر بھی منحصر ہے کہ ایسے وقت، کوئی اصلی کیفیت میں کب آتا ہے۔ وہ حادثہ تھا بھی ہیڈ آن حادثہ۔

پچھلے کچھ عرصے سے شفقت لگاتار یہ نقطہ اُٹھا رہی تھی کہ پیداواری اکائی کے لیے تحقیق اور ترقی کا کوئی شعبہ نہیں۔ یہ درست تھا۔ اپنی تنظیم کو جدید تر خطوط پر چلانے کے باوجود میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہاں میں اپنے مدِ مقابل لوگوں سے مختلف نہیں تھا۔ بیرونِ ملک دوروں میں جو جہاں بھی اچھی product دیکھی، اُس کو اپنے ہاں بنا دیا۔ شفقت کا نقطۂ نظر تھا کہ یہ قزاقی بند ہونی چاہیے۔ اُس دن دفتر میں مصروفیت برائے نام تھی۔ ہمیں یہ معاملہ زیرِ بحث لانا تھا۔ چنانچہ میں ہلکے سر درد کے باوجود دفتر چلا آیا۔ نتیجہ؟

پری کے ساتھ ہیڈ آن حادثہ!

ہر حادثے کے بعد انسان سوچتا ہے کہ کاش وہ اُس مخصوص وقت پر وہاں نہ ہوتا! بعد میں کئی دفعہ یہ خیال میرے ذہن میں آیا۔ میرا تجزیاتی نتیجہ یہی تھا کہ وہاں میری موجودگی ضروری تھی۔ میں نے اُس حادثے کے نتیجے میں اُن رنگوں کا سایہ دیکھا جن کی تپش سے مجھے محروم رہنا تھا۔ میری زندگی میں رنگ ہی رنگ تھے، اتنے زیادہ کہ مجھے اُن کی پہچان ہی نہ رہی۔ ان تمام رنگینیوں کے باوجود میرے دن رات پھیکے تھے۔ میری ایک حیثیت تھی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر میں نے اپنے لیے ایک مقام بنا لیا تھا۔ تیس برس پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ اُس وقت تک میں زندگی کی تمام لطافتیں دیکھ چکا تھا۔ ترقی کی خواہش میرے اندر ابل رہی تھی۔ شادی کے بعد ایک پرسکون اور تدبیراتی زندگی کا خواب میرے ذہن میں پر تول رہا تھا۔ میری بیوی قدم ملا کے ساتھ چلنے کو تیار تھی۔ ہم امنگوں کو سنبھالے اپنے سفر پر چل پڑے۔ کامیابیوں نے ہماری راہ میں دامن پھیلا دیے تھے۔ چار برس ہمارے لیے شاید چند گھنٹوں کے برابر تھے۔ شادی سے کچھ عرصہ پہلے میری بیوی کے نظامِ تولید میں السر بن گیا تھا۔ اس بیماری کا علاج میری بیوی کو پیداواری صلاحیتوں سے محروم کر گیا۔ اس کا ہمیں علم نہیں تھا۔ یہ بھی ایک حادثہ تھا۔ اس کا ردِعمل میری توقع کے خلاف ہوا۔ میرے باپ نے دوسری شادی کے لیے مجھے بہت مجبور کیا۔ اُس کی کوئی دلیل مجھے متاثر نہ کرسکی۔ میں دوسری شادی پر تو رضامند نہ ہوا لیکن اپنی بیوی سے دور ہوگیا۔ موت تک اُس کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا۔ میرے زندگی میں تین ہی شوق رہ گئے۔ کام، شراب، عورت۔ کام کی

زیادتی مجھے تھکا دیتی۔ تھکاوٹ کا ازالہ میں شراب سے کرتا لیکن نشہ مجھے بے چین کر دیتا۔ اس سلگتی کیفیت کو نسوانی قرب کی شبنم بجھاتی۔ یہ سارا عمل مجھے مزید محنت پہ اکساتا۔

کافی آ گئی۔

’’تم اپنی مہمان کا اور میرا تعارف نہیں کراؤ گی‘‘۔ میں نے شفقت کو مخاطب کیا۔

’’ہم تین دوست ہیں‘‘۔ وہ جھجکتے ہوئے ہنسی۔ ’’میری ایک دوست بشریٰ ہے اور یہ اُس کی دوست۔ ایک تکون کی طرح۔ ہم ایک دوسرے سے ملے تو نہیں لیکن پچھلے کئی برسوں سے جانتے ضرور ہیں۔ بشریٰ ہماری مشترک دوست ہے۔ اس کا نام زہرہ ہے......زہرہ جبیں‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے میں نے خود کو سنبھالا۔ میرے چہرے یا آنکھوں سے اگر کسی شوق نے باہر جھانکا تھا اُسے میں نے مناسب احتیاط سے واپس دماغ کے کسی خاص گوشے میں رکھ دیا۔

’’بشریٰ نے ملازمت کے لیے سفارش کی ہے‘‘۔ شفقت نے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ مجھے اپنے ہاکی کھیلنے کے دن یاد آ گئے۔ میرا اِن گول کرانے کا موقع بنا کر مجھے پاس دیتے ہوئے دیکھتا۔ میں جب گیند کو سنبھال لیتا تو وہ دفاعی پوزیشن میں چلا جاتا۔ یہی تاثر شفقت کے دیکھنے میں تھا۔

کیا میں گول سکور کر سکوں گا؟

اپنے کاروبار کو سنبھالنے کے بعد تنظیمِ نو کرتے ہوئے میں نے اپنا کردار منیجر کے بجائے لیڈر تعین کیا۔ مجھے فیصلے کرنا تھے۔ میں نے مشکل فیصلے نہ صرف کرنا سیکھے بلکہ کیے بھی۔ میری پچھلی زندگی دلیرانہ فیصلوں سے بھری ہوئی تھی۔

اپنے دفتر میں جانے کے لیے اُٹھا تو میں واقعی پریشان تھا۔ میرے فیصلوں کا انحصار کئی مستقل عوامل پر ہوتا تھا۔ وہ تمام ایک میکانکی عمل بن گئے تھے۔ میں نے دفتر میں بیٹھ کر سوچا کہ مجھے بہت احتیاط سے چلنا ہوگا۔ میرے اقدام میں اعتماد اور دور اندیشی ہونی چاہیے۔ مجھے پری کے ساتھ اپنے تعلقات کا تعین کرنا تھا۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ وہ میرے ساتھ کتنا دور چل سکتی ہے۔ مجھے اس کی سماجی حیثیت کا قطعاً علم نہیں تھا۔ مجھے اُس کے بارے میں تمام تفصیل جاننا تھی۔ اس کام کے لیے میں نے کبھی بھی رازداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا تھا۔ میں نے پری کو دفتر میں بلانے کا فیصلہ کیا۔

دفتر کی سجاوٹ میں میرے خاندان کی ترقی کی شدید خواہش اور مکارانہ بازگشت شامل تھیں۔ میرا پردادا کسی گاؤں میں ایک بے نام سا آدمی تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ دیہہ کس ملک کا حصہ بنا، مجھے نہیں پتا۔ یہ ایک المیہ ہے۔ میری کامیابی کے درخت کی یہ بہت کمزور جڑ ہے۔ یہ ترقی بعض اوقات بہت سطحی نظر آتی۔ میں نے زندگی میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ منزل کو اگر تاریخ کے ستونوں کا سہارا نہ ملے تو عمارت میں پائیداری کی سجاوٹ نہیں آ سکتی۔ ماضی میرے باپ کی محنت اور مکاری کے دریا کے پار، شور والی زمین میں دفن ہے۔ مجھے پردادے کا نام بھی نہیں معلوم۔ اُس کے پاس ایک ایسے آدمی نے پناہ لی جس کی گرفتاری پر انعام تھا۔ پردادا نے اُسے گرفتار کروا دیا۔ صلے میں اُس کے بیٹے یعنی میرے دادا کو پولیس میں پیادہ سپاہی بھرتی کر لیا گیا۔ اُس وقت میرے دادا کی عمر سولہ یا سترہ برس تھی۔ اُن دنوں غالباً پولیس رشوت نہیں لیتی تھی یا قوانین اتنے موثر تھے کہ ایسا سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ بحر حال میرے دادا نے تمام عمر پیادہ سپاہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سے لوگ اُسے سست آدمی کہتے تھے۔ میرے خیال میں وہ کاہل نہیں تھا۔ اُس کے فیصلے میں مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُس نے دورانِ ملازمت میں کئی طبقوں کے لوگوں کو دیکھا۔ وہ اس نتیجے پہ پہنچا کہ تعلیم مستقبل کی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ اُس نے میرے باپ کو سکول میں داخل کرا دیا۔ خود وہ بڑے تھانے داروں کا اردلی رہا۔ اُن کے لیے ضروریات کی خرید و فروخت میں سے ہمیشہ چند پیسے اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ آپنا اور بیٹے کا کھانا بھی اُنھیں کے باورچی خانے سے آتا۔ میرے باپ نے جب دسویں پاس کی تو اُس وقت نہ صرف وہ شادی شدہ تھا بلکہ میری پیدائش بھی ہو چکی تھی۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ ملک تقسیم ہوا تو میرا دادا اسی شہر میں ملازمت کر رہا تھا۔ اُس نے لوٹ مار میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن ہندوستان جانے والے خاندانوں سے مراعات کے بدلے سونا ضرور لیا۔ اُس کی ملازمت 1950ء میں ختم ہوئی۔ اُس وقت ہم ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ میرے دادا کی ترقی کی خواہش میرے باپ میں منتقل ہو چکی تھی۔

حمیدی

وہ بکھرے ٹکڑوں کو یکجا کر کے نئی شکل دینے کا زمانہ تھا، جیسے بچوں کی بلاک گیمز۔ میرے باپ نے اندازہ لگایا کہ مستقبل صنعت میں ہے۔ ملک ایک نومولود بچے کی طرح ہے۔ بچے نے پھلنا پھولنا ہے۔ وقت کے ساتھ اس کے نقوش واضح ہونا ہیں۔ معاشرے نے اپنی تشکیل مکمل کرنی ہے۔ ترقی کا زینہ ابھی خالی ہے۔ یک لخت ایک ہجوم نے اس پر دھاوا بولنا ہے۔ افراتفری میں لوگ کچلے جائیں گے۔ صرف طاقت ور لوگوں نے واحد سیڑھی کی بدولت بلند ترین مقام تک پہنچنا ہے۔ وہ شاید اتنا تن آور نہیں تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ جب تک تمام لوگ سکتے میں ہیں وہ سیڑھی کی جانب چل پڑے۔ یہ ایسا فیصلہ تھا جس نے اُسے بہت تھوڑے عرصے میں شہر کے اہم لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ میرے باپ کی بنک کے ایک کیشیئر سے ملاقات تھی۔ دونوں نے ایک صنعت لگانے کا فیصلہ کیا۔ میرے باپ کے پاس دادا کا تقسیم ملک پر ٹھگا تھوڑا سا سرمایا تھا۔ اس رقم سے جگہ خرید کر عمارت کھڑی کر دی گئی۔ یہ ڈھانچہ میرے باپ کے نام تھا۔ مشترکہ ملکیت میں کیشیئر کی ملازمت رکاوٹ تھی۔ وہ دور اخلاقی روایات کی برتری کا تھا۔ اعتماد کیشیئر کو لے ڈوبا۔ اس نے میرے باپ کی اعانت سے بینک میں فراڈ کیا۔ مشینری اور فیکٹری کو چلانے کے لیے درکار رقم غیر قانونی طور پر حاصل کی۔ یہ بھی میرے باپ کے کھاتے میں جمع ہوئی تھی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میرا باپ اپنے دادا کے نقشِ قدم پر چلا۔ کیشیئر کی کسی طرح مخبری ہو گئی۔ گرفتاری کے بعد اسے طویل عرصے کے لیے جیل جانا پڑا۔ میرا باپ پیداوار اور تقسیم کے بنیادی اصولوں سے ناواقف تھا۔ اس صنعت کو چلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے ایک مدِ مقابل فیکٹری کے فورمین سے ساز باز کیا۔ اسے آدھی شراکت اور تنخواہ پر اپنے پاس لے آیا۔ اس طرح موجودہ سلسلے کی بنیاد رکھی گئی۔ ہماری مکاری یہاں تک ختم نہیں ہوئی۔ میرا باپ کئی کئی دن فیکٹری میں رہتا۔ وہ تیزی کے ساتھ کام کو سمجھ رہا تھا۔ جلد ہی وہ پیداوار، تقسیم اور مشینری کی دیکھ بھال کے مراحل سمجھ گیا۔ اسے اب فورمین کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اگر قانونی طریقہ اپنایا جاتا تو فیکٹری کی آدھی ملکیت اس کی تھی۔ یہاں پھر ترقی کے اندھے جذبے نے میرے باپ کو اکسایا۔ وہ انتہائی اقدام کر گزرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ وقت تھا جب معاشرہ پرانی اخلاقی اقدار کے بوجھ کو برداشت نہیں کر رہا تھا۔ یہ اس کے راستے کی رکاوٹ تھی۔

تقسیم کے بھیانک اثرات نے مقامی اور آنے والوں کو ایک سکتے کی کیفیت میں دھکیل دیا تھا۔ تین چار سال کے بعد لوگ اس حالت سے باہر آنا شروع ہوئے۔ یہ وقت تھا ملک کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کا۔ مگر ایسا نظام وجود میں آنے لگا جس کی نئیں خود غرضی، لالچ اور رشوت سے بھری جا رہی تھی۔ ملک کو بنانے والے اور اس میں رہنے والے ایک دوڑ میں جت گئے۔ اس مقابلے کو جیتنے کے لیے دولت اور جائداد کا فیتہ کاٹنا تھا۔ ترقی کی سیڑھی افراتفری کا شکار تھی۔ لوگ پیروں تلے کچلے جا رہے تھے۔ بعض لوگوں نے اُس زینے کو ترک کر دیا۔ انہوں نے سیڑھی والی دیوار پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔ میرا باپ بھی اُن میں شامل تھا۔ اُس نے ایک رات اپنے شراکت دار کو بھٹی میں دھکیل دیا۔ آج تک فورمین کاروباری دورے سے واپس نہیں آیا......

میں نے انٹر کام پر شفقت کا نمبر ملایا۔ اُس نے دوسری گھنٹی پر فون اُٹھا لیا۔

’’ہیلو!‘‘

’’شفقت!‘‘

’’سر‘‘

’’اپنی دوست...... کیا نام ہے اُس کا‘‘۔ میری عمر کی مکاری حرکت میں آ گئی۔

’’زہرہ جبیں‘‘۔ شفقت نے مجھے یاد دلایا۔

’’ہاں...... اُسے بھیج دو‘‘۔

میرا دفتر میری کامیابی کی تحریر کا عکس ہے۔ یہ دور کامیاب ہونے کا نہیں بلکہ مکمل کامیابی حاصل کرنے کا ہے۔ اس کے حصول کے لیے کئی گُر آزمانا پڑتے ہیں۔ دفتر کی سجاوٹ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اسے دلکشی کی موجودہ سطح پر لانے کے لیے مجھے کئی برس لگے۔ یہ وقت ظاہری خوبصورتی کا ہے۔ میں تو کامیاب کاروبار کا مالک ہوں۔ آج کل ظاہری نمود و نمائش کے لیے ذرائع بھی پیچھے چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ میرے باپ نے جب ایک چھوٹی سی عمارت میں کارخانہ

شروع کیا تو اُس وقت زیادہ توجہ معیار پر تھی۔ مجھے یاد ہے اُس کا دفتر برائے نام تھا۔ کلرک، اکاؤنٹنٹ، چند دوسرے لوگ اور وہ ایک ہی کمرے میں بیٹھتے۔ کئی برس ایسے ہی گزرے۔ ایوب خان کا زمانہ صنعتی انقلاب کا آغاز تھا۔ اس میں صنعتی ترقی سوچ کی طرح بڑھی۔ معیار کے ساتھ ساتھ دکھاوے کا رجحان بھی بڑھا۔ یہ دور بہت مختصر تھا۔ صنعت کار تقریباً پندرہ سے بیس برسوں کے اندر ہی دل برداشتہ ہو گئے۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ اُسے اپنی سرمایا کاری کا نتیجہ کئی نسلوں تک لینا ہوتا ہے۔ وہ شاید ملک کے مستقبل سے مطمئن نہیں تھا۔ صنعتی اور سرمایہ کاری کی سرکاری پالیسیاں پالنے میں کھیلتے بچے کے کپڑوں کی طرح تھیں۔ ماں اُسے جو چاہتی پہنا دیتی ہے۔ بیشتر سرمایہ دار اپنی پونجی لے کر باہر کی دنیا میں کھو گئے۔ میرے جیسوں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں بھی اپنے سرمائے کو محفوظ رکھنا تھا۔ یہاں باہر کے مقابلے میں کئی فائدے تھے۔ ایک تو زندگی Un-complicated تھی۔ مزدور سستا اور احمق ہے۔ حکومتیں نالائق اور لالچی ہیں۔ چناں چہ یہاں میں نے خود کو سیڑھی کی بلندیوں کی طرف چڑھتے پایا۔ میرا دفتر بھی اس سلسلے کی کڑی تھا۔ میرا دعویٰ تھا کہ یہاں داخل ہونے والا پہلی ہی نظر میں کلین بولڈ ہو جاتا ہے۔

پری دفتر میں داخل ہوئی۔ میں اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بغیر کسی طرف دیکھے' اعتماد سے چلتی، میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرا دفتر اُسے مرعوب نہ کر سکا۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ میں اُس وقت یہ طے نہ کر سکا کہ کون جیتا ہے؟ سامنے پری بیٹھی تھی۔ کسی حد تک مغرور اور لاتعلق۔

''تم نے پہلے کہیں کام کیا ہے؟''

''نہیں''۔

''ابھی کیوں ضرورت پیش آ گئی؟'' میرے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''ملازمت دو وجوہات کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ مجبوری سے یا پھر اپنی خودمختاری قائم رکھنے کے لیے''۔

مجھے اس کے جواب نے متاثر کیا۔

''تمہاری کیا وجہ ہے؟''۔

''دونوں!'' اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ میں نے غور کیا کہ وہ بات کرتے ہوئے میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس مختصر گفتگو میں ایک آدھ بار ہماری نظریں ملیں تو وہ اُنہیں بہت ہی آہستگی کے ساتھ جھکا گئی جیسے کمرے میں کسی کو سوتا دیکھ کے آپ دروازہ بند کر کے پلٹ جائیں۔ میں اُس کے خیالات یا محسوسات جاننے میں ناکام رہا۔ اس مکالمے میں اُس نے مجھے ''سر'' نہیں کہا تھا۔ اُس کے لہجے میں ناموافقت تھی۔ میں اُسی وقت اُسے چلتا کر سکتا تھا مگر کوئی چیز مجھے روکے رہی۔ شاید میری شکست کی ابتدا تھی۔

''تم رہتی کہاں ہو؟''

اُس نے کسی گلی اور محلے کا نام بڑبڑایا۔ میں اُس جگہ کا تعین نہ کر سکا۔

''تمہارے گھر میں کتنے افراد ہیں؟'' میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اُس نے سوال کو نظرانداز کر دیا۔ مجھے ایک دم طیش آیا۔ میں نے اُسے باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اپنے چہرے کے تاثرات بدلتے محسوس ہوئے۔ میری نظریں سامنے گئیں۔ میں نے دیکھا کہ پری مجھے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ وہاں پاکیزگی کی چمک کے بجائے شرارت رقص کر رہی تھی۔ میں دم بخود ہو گیا۔

''زیادہ لوگ نہیں۔'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ مجھے لگا کہ میرے ہاتھ سے کانچ کا گلاس گر کے ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

میں بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

''میری ملازمت کے ساتھ میرے گھر والوں کا کیا تعلق ہے''۔ اُس کی آواز میں قہقہہ تھا۔

''ہے!'' میں نے جواب دیا۔

''کیا؟''

''تمہیں بہتر جاننا اور سمجھنا''۔ اُس نے لمبا سانس لیا اور نظریں جھکا لیں۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ خاموشی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ پری کے وجود نے کمرے کو بھر دیا تھا۔ یہاں پڑی مہنگی اشیاء معمولی ہو کے رہ گئیں تھیں۔ وہ کسی زرتاب لباس میں نہیں تھی لیکن

میرا دفتر غیر اہم سا ہو گیا تھا۔ یہاں بہت ضروری ملاقاتیں اور فیصلے ہوئے تھے۔ اس کمرے سے میں سدا کامیابی کا کارنیشن اپنے کوٹ میں سجا کر ملاقاتیوں کو الوداع کہنے باہر نکلتا رہا تھا۔ آج میری کیفیت ملی جلی تھی۔ میں نے کوئی سودا طے نہیں کیا تھا۔ میری ملاقاتی ملازمت ڈھونڈنے آئی تھی۔ میں نے خود کو ہمیشہ ناقابلِ تسخیر سمجھا تھا۔ آج شاید یہ لڑکی مجھے فتح کرنے پہ تلی تھی۔

''تمہاری تعلیم''۔ میں نے خاموشی توڑی۔

''ایم۔ ایس۔ سی سٹیٹکس''، میں کلین بولڈ ہو گیا۔

''تم کون سا کام کرنا چاہو گی؟''

''اکاونٹس''۔

''یہ نہایت خشک اور کٹھن کام ہے۔ کیا تم یہ سنبھال سکو گی؟'' یہ عورت مجھے حیرت میں رکھے ہوئے تھی۔ میرا خیال تھا کہ واقعات کی باگ میں خود سنبھالوں گا۔ لیکن مجھے لگام اپنے ہاتھ سے پھسلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔ کیا پری اور میں کوئی تعلق قائم کر سکیں گے؟ اگر ہم میں کوئی رشتہ قائم ہو گیا تو اُس کی عنان کس کے ہاتھ میں ہو گی؟ میں نے بچپن ہی سے اپنے معاملات اپنی مرضی کے مطابق طے کیے تھے۔ میری زندگی خود مختارانہ روش پہ رواں رہی تھی۔ بعض اوقات اس آزادی سے اُکتا جاتا۔ اُکتاہٹ کے باوجود اختیارات کی بہتات کا اپنا ایک سرور تھا۔ میری کامیابی کی وجہ بھی یہی تھی۔ میں اپنے آپ میں مگن تھا۔ کامیابی نے میرے گرد ایک نازک سا حصار بنا دیا تھا۔ میں اسی قید میں مطمئن تھا۔ پری مجھے کسی اور طرف لیے جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا وہ کالی کافی کا پیالہ تھی جو ذہن پہ چھائے خمار کی دھند کو کڑواہٹ کے مزے دار ذائقہ سے دور کر دے گی۔ میں نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

''مجھے ہندسے پسند ہیں''۔

''تمہارے کاغذات؟'' میں اپنی غیر جانبداری ثابت کرنے پہ تلا ہوا تھا۔

''میں نہیں لائی''۔

''ٹھیک! کل مجھے دکھاؤ''۔ کاغذات کی تصدیق میں نے خود کبھی نہیں کی تھی۔ یہ شفقت بھی

''ٹھیک! کل مجھے دکھاؤ''۔ کاغذات کی تصدیق میں نے خود کبھی نہیں کی تھی۔ یہ شفقت بھی

نہیں کرتی۔ میں پری کو اگلے اور اُس سے اگلے دن بھی ملنا چاہتا تھا۔ میں نے انٹر کام ملایا۔

''شفقت' زہرہ جبیں اپنے کاغذات لائے گی۔ اسے کل میرے ساتھ ملاقات کا کوئی وقت دے دو''۔

''سر''۔ میں نے شفقت کے لہجے میں حیرت محسوس کی۔

II

اُس شام جب گھر گیا تو زندگی میں پہلی دفعہ خود کو مکمل محسوس کیا۔ میری بیوی کا نام رخشندہ ہے۔ اُس کے ساتھ گزرے پہلے چار برس پرکشش، ہلکے اور روقت کی طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ اُس دور میں ایک دوسرے کو پا لینے کا جذبہ قوی تھا۔ یہ تکمیل ریت کے پہاڑ میں پانی ڈھونڈنے کے مترادف تھی۔ جتنی ریت ہٹاؤ اتنی ہی اور آ جاتی ہے۔ مجھے گھر کی ہر چیز میں ایک ترتیب دکھائی دی۔ اس سے پہلے میں لگاتار کئی برس تک سلیقے کے فقدان پر نکتہ چینی کرتا رہا تھا۔ مجھے رخشندہ میں بھی کشش نظر آتی۔ رخشندہ سے میرا اختلاف اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی وجہ تھا۔ رسموں کی گھٹن اور رواجوں کی اذیت کو سمجھتا ہوں۔ میں نے تینوں انتہائیں دیکھی ہیں۔ یہ وہ تکون ہے جس میں ہر فرد اور خاندان کی زندگی مقید ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ طے نہیں کر سکے کہ ہم کون ہیں۔ تمام کے تمام بزدلی کے بوجھ تلے دبے ہیں۔ ہم اس حبس سے رہائی پانا چاہتے ہیں مگر آزادی سے ڈرتے ہیں۔ اپنا تشخص قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن اُس کے ساتھ منسلک ذمے داریوں سے خائف ہیں۔ ابھی تک یہ یقین نہیں ہو سکا کہ ہماری پہچان کون سی ترتیب میں مضمر ہے، پیشہ، مذہب، ملک یا ملک' مذہب' پیشہ یا مذہب' ملک' پیشہ! مجھے یاد ہے میری ماں ''اماں'' ہوا کرتی تھی اور باپ ''ابو جان۔'' ماں پانچ وقت نماز پڑھتی۔ مذہب کے تمام لازم اور چند خود ساختہ فرائض ادا کرتی۔ معاشی ترقی کے ساتھ وہ ''امی'' بن گئی اور ابو جان ''ڈیڈی'' کہلانے لگے۔ باپ کی خواہش تھی کہ ماں خود کو مذہب تک محدود نہ رکھے۔ اُسے ماں کی اور شعبوں میں بھی ضرورت تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ اپنے خاوند کے کندھے سے کندھا ملائے مگر خوفزدہ تھی کہ ایک رسم ٹوٹ جائے گی۔ اُس نے چادر کے بجائے دوپٹا اوڑھ لیا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ میرے باپ کو اُس کی مذہبی دلچسپی پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ اُس کے اندر کی جدید عورت کو جگانا چاہتا تھا۔ باپ کو ماں کے اندر کی انگڑائی سے بھی خوف تھا کہ اُس کی ذاتی زندگی جان جائے گی۔ میرے باپ میں وہ تمام عادتیں تھیں جو نئے دولت مندوں میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ماں کو اُکساتا ضرور مگر مجبور نہ کرتا۔ جوانی میں قدم رکھنے کے بعد میں نے اپنی زندگی آپ جینے کا فیصلہ کیا۔ اس میں میری ہاسٹل اور باہر کی تعلیم کو بہت دخل ہے۔ میں ایک جدید زندگی گزارنا چاہتا تھا، جس میں اپنی مرضی کی شادی بھی شامل تھی۔ اگر بیوی کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہوں تو طلاق سے گریز نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں نے وہی کیا جو ہمارے ہاں کا دستور تھا۔ ہمارا گھرانہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ سب کی الگ الگ زندگیاں تھیں لیکن ہم ایک ایسے کچے دھاگے سے بندھے ہوئے تھے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا تھا اگرچہ اُس میں کتنے ہی بل پڑ گئے تھے۔ رخشندہ کو میں نے طلاق تو نہ دی لیکن اُس سے دل برداشتہ ضرور ہو گیا۔ جیسی زندگی ہمارے گھر میں تھی، ویسی ہی ہر خاندان کی تھی۔ ہر کوئی اپنی زندگی کو بدلنا چاہتا تھا مگر خائف تھا۔ روایت سے وابستگی تاریخ کی توسیع ہے۔ کیا ہر خاندان کا ماضی میری طرح کا ہے؟ کیا اُن کی روایت میں بھی لوٹ کھسوٹ اور بزدلی نہیں؟ شاید اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے میں قنوطیت کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اطراف میں ناانصافی اور ظلم نظر آیا۔ ایوب خان کے زمانے میں جب صنعتی نظام نئے دور میں داخل ہوا تو سوچ کا رخ بھی بدلا۔ صنعت کار مفادات کی خاطر بیویوں کو داؤ پر لگانے کو تیار ہو گئے۔ میں ہاسٹل میں داخل تھا۔ مجھے تیراکی، ہاکی، گھڑ سواری اور کتابوں نے اپنے جادو میں لے رکھا تھا۔ زندگی کئی قسم کی مبارزتوں کا مجموعہ تھی۔ میرے باپ نے اپنی خاندانی موقع شناسی بروئے کار لاتے ہوئے دوسری شادی کر لی۔ میلے دھوتی کرتا کے بجائے سفید بے داغ شلوار قمیص اور پھر تھری پیس سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ پنجابی، اردو اور انگریزی ایک ہی لہجے میں بولتا تھا۔

چھٹیوں میں مجھے اس نئی ڈویلپمنٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ میں باپ کی دوسری بیوی سے نہیں ملا لیکن ماں کی حالت دیکھ کر کافی پریشان ہوا۔ وہ باپ کی اس حرکت پر سمجھوتا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُسے حقوق غصب ہونے سے زیادہ اپنی ناک کی فکر تھی۔ وہ اپنے عزیزوں کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ عزت میں کمی کا خوف وبالِ جاں بن گیا تھا۔ باپ نے اپنی دوسری بیوی کے لیے علیحدہ گھر لے لیا تھا۔ وہاں صرف دعوتیں ہوتیں۔ مجھے بھی چند ایک میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ میری عمر اور سوچ ابھی اس قابل نہیں تھی مگر، سچی بات ہے، کہ میں ان محفلوں سے لطف اندوز ضرور ہوا۔ وہاں مغربی موسیقی کے ساتھ خوبصورت عورتیں تھیں۔ پھر بھی مجھے اپنے باپ کا فیصلہ پسند نہ آیا۔ کئی سالوں کے بعد جب تمام کاروبار میں نے سنبھالا تو مجھے حیرت ہوئی کہ باپ کی دوسری شادی کے بعد ہماری فرم نے بہت ترقی کی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں باپ نے معاہدے کے تحت حصہ ادا کر کے دوسری بیوی کو طلاق دے دی اور یوں میری ماں کا سر دوبارہ اونچا کر دیا۔ اس فیصلے میں بھی خاندانی مکاری شامل تھی۔ اُس نے میرے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ دور کر دی تھی۔

میں کاروبار کو اپنی ذاتی محرومیوں کے باوجود آگے بڑھاتا رہا۔ اس میں اپنے خاندان کی ترقی کی شدید خواہش بھی شامل تھی۔ میں ہر طرح کے ذرائع استعمال کر کے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ فرزند کے علاوہ مجھے کسی سے سروکار نہیں تھا۔ وہ میرے باپ کے ایک بہت ہی قریبی دوست قربان کا بیٹا تھا۔ ہم دونوں ہاسٹل میں اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے میں امریکہ میں اور فرزند یورپ میں تھا، تو ہم چھٹیوں میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ میں پیار سے اُسے فرزندِ قربان کہا کرتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ بعض اوقات میرا باپ اس تعلق کو شک کی نظر سے دیکھتا۔ رخشندہ سے میری دوری کے بعد ہم ہر شام اکٹھے گزارتے۔ ہماری دلچسپیاں ایک تھیں۔ وہ شاید میری ذات کے نامکمل حصے کی تکمیل کرتا۔ اُس شام جب میں نے خود کو مکمل محسوس کیا تو فرزندِ قربان سے نہیں ملا۔ تقریباً پندرہ سال بعد رخشندہ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ پری نے میرے اندر ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی تھی۔ رخشندہ اور میں رات بیٹھے رہے۔ ہم نے اپنی گفتگو کے دوران میں کئی برسوں کے دریائے دوری پر ایک پل تعمیر کر دیا۔ وہ کولڈ ڈرنک اور میں وائن کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ میں نے اپنے ہاں اولاد نہ ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ ایک عرصے کے بعد میں نے رخشندہ کا قہقہہ سنا تھا۔ میں بھی اُس کی باتوں پر دل کھول کر ہنسا۔ بعض اوقات وہ شام مجھے بالکل ہی مصنوعی لگتی فلم کے سیٹ کی طرح۔ میں رخشندہ سے محوِ کلام نہیں تھا۔ پری میرے اندر سرایت کر گئی تھی۔ یہ اس کا جادو تھا جس نے مجھے کیلا ہوا تھا۔ میں دراصل گھر کی ہر شے میں اس کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے اُکساتی رہی۔ میں اُس کی انگیخت پر عمل کرتا رہا۔ رخشندہ کی زندگی کے اوراق سے برسوں کی بدہیت تحریریں مٹ رہی تھیں۔ مجھے اپنی خود غرضی پر پچھتاوا نہیں تھا۔ یہ تو میرے وجود کا حصہ تھی۔

رات بہت بیت گئی۔ ہماری آوازوں میں باہر گرتی شبنم کا بوجھل پن در آنا شروع ہو گیا۔ ہمارے درمیان پھیلے فاصلوں کی میل کو یہ قطرے دھوتے رہے۔ جیسے جیسے یہ میل اُترتی گئی ہمارے فاصلے کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم شبنم کے موتیوں کی طرح پاک ہو گئے۔ دونوں ایک ہی منزل کا حصہ بن گئے۔ پری بھی وہاں موجود تھی۔ میں اُسے دیکھ تو نہیں سکا لیکن اُس کی موجودگی کو محسوس ضرور کر رہا تھا۔ رخشندہ مطمئن تھی کہ اُس نے مجھے واپس لے لیا ہے۔ پھر اچانک میں پریشان ہو گیا۔ مجھے اس خوبصورت رات کی سچائی پر شک ہونے لگا۔ پری کہیں تھی ہی نہیں۔ بستر سے رخشندہ کے آسودہ خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں حقیقت میں لوٹ آیا۔ رخشندہ نے مجھے دھوکا دیا۔ اس نے ورغلا کے مجھے پری سے دور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ پری کی آنکھوں سے ٹپکتی چمک میری نظر میں بسی ہوئی تھی۔ میرے لاشعور میں رچے اُس کے غرور اور لاتعلقی نے مجھے بے بس کر دیا...... میں آہستہ سے دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سالہا سال سے میں اکیلا رہتا رہا ہوں۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ پری دھیرے دھیرے مجھے سہلاتی رہی۔ میں آہستہ آہستہ نیند کی طرف بڑھتا گیا...... صبح جب میں اٹھا تو ہر شے معمول کے مطابق تھی۔ رخشندہ کے وجود میں غالباً کئی توقعات نے آنکھیں کھول دیں تھی۔ میں نے اسے روزمرہ کی اکتاہٹ اور بیزاری سے دیکھا۔ وہ میرے سامنے کچے برتن کی طرح ٹوٹ گئی۔ ایسی چیزیں ہر دفعہ جوڑی نہیں جا سکتیں۔ میں نے اسے رات کو یکجا کر دیا تھا۔ اب اگر وہ پھر ریزہ ریزہ ہو گئی ہے تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے مجھے ماضی میں سراب دکھایا تھا۔ پری بے یقینی کے دھندلکے میں کھڑی تھی۔ مجھے اس حقیقت تک پہنچنا تھا۔

III

صبح دفتر میں پری نے دوبارہ مجھے کلین بولڈ کر دیا۔ وہ فرسٹ ڈویژن ایم ایس سی تھی۔ پچھلے دِنوں میں نے اور شفقت نے اپنے ادارے میں ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اخباروں میں امیدواروں کے انٹرویو وغیرہ کا اشتہار دینا تھا۔ پری کو میں نے ریسرچ کے شعبے کی انچارج بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ماتحت ہماری صنعتوں سے وابستہ دو افراد نے کام کرنا تھا۔ پری نے ان دونوں کے کام کی نگرانی کرنا تھی، جس میں اعداد و شمار کی بھرمار تھی۔

میری خواہش تھی کہ وہ میرے ہی دفتر میں بیٹھے کیوں کہ اب وہ میری تنظیم کا حصہ بن چکی تھی۔ مگر اس میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ سب سے اہم معاملہ ہم دونوں کی شہرت اور کردار کے تحفظ کا تھا۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ مراسم کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ میرے مزاج میں باس کے رویے کے ساتھ ایک دوست کی اپنائیت بھی ضروری تھی۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ وہ محض ایک ماتحت ہو کر نہ رہ جائے۔ مجھے اتنا پتا تھا کہ محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے۔ اندھا انصاف کا دیوتا بھی ہوتا ہے لیکن اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی ڈھیلی ہوتی ہے، وہ کناروں سے دیکھ سکتا ہے جب کہ محبت کا دیوتا دیکھتا نہیں، وہ بہت ظالم ہوتا ہے۔ تیر اس طرح چلاتا ہے کہ نشانہ دو جگہوں پر لگے۔ کیا محبت کا دیوتا اپنا تیر چلا چکا تھا؟ چاروں طرف خود غرضی اور موقع پرستی تھی۔ میں بھی ان عوامل کا حصہ تھا۔ اندیشہ یہ تھا کہ تیر صرف مجھے ہی نہ لگا ہو اور پری اس کی زد سے کہیں باہر ہی نہ رہ گئی ہو۔ میں اس کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ملازمت ملنے پر اس کا تاثر کیا تھا؟ مجھے یقین تھا کہ اتنا عمدہ پیکیج ملنے پر وہ خوش ضرور ہوگی۔ زبان سے چاہے کچھ نہ کہے، اس کی بولتی آنکھیں پیغام ضرور دیں گی۔ وہ شفقت کے دفتر میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ صبح میری اس سے مختصر سی ملاقات ہو چکی تھی۔ کاغذات دیکھنے کے بعد میں نے اُسے شفقت کے دفتر میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ میں نے اسے بلا بھیجا۔

وہ اُسی بے اعتنائی سے داخل ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کہیں اس کا قدرتی انداز ہی نہ ہو۔ اس بات کے ذہن میں آتے ہی مجھے تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی۔ تاہم اسے میں اسی غرور اور لاپرواہی کے لبادے میں دیکھنا چاہتا تھا۔

میرے اشارہ کرنے پر وہ بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اس نے آئینے پر پلکوں کا پردہ تان دیا۔ اس کی نشست کے انداز میں کوئی جھجھک نہیں تھی، بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ معمول کے واقعات پر تبادلہ خیال کے لیے آئی ہو۔

”تمہاری تعیناتی ریسرچ سیکشن کی انچارج کے طور پر کی گئی ہے۔“ میں نے اس اطلاع کو اس تک پہنچنے کا وقفہ دیا۔ اب وہ میری آنکھوں میں ڈول ڈال رہی تھی۔

”میری تنخواہ اور کام کے اوقات کیا ہوں گے۔“ اس کے تخاطب سے یقین چھلک رہا تھا جیسے اسے ملازمت دینا میری مجبوری تھی۔ اس کے لہجے میں ایک حد تک گستاخی بھی نمایاں تھی۔

”میں اپنے ماتحتوں کو ہر طرح کی سہولت دیتا ہوں۔ اس میں تنخواہ شامل ہے۔“

”میں غروب آفتاب سے پہلے گھر پہنچنا پسند کرتی ہوں۔“

”ایسا روز نہیں ہو سکے گا۔“

”میں ایک روز بھی دیر نہیں کر سکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے اُٹھنے کے لیے جسم کو حرکت دی۔

”تنخواہ نہیں جاننا چاہو گی؟“ میں اس کی صحبت کے لیے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھا۔

اس کی آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔

”پچیس ہزار۔“ یہ ایک ریکارڈ تھا۔

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اس کے بعد، میں دیر تک سوچتا رہا۔ اس

تاثر میں تشکر تھا نہ اطمینان۔ ایک پراسرار سا کوندا تھا، جیسے شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ویرانے لمحہ بھر کے لیے روشن ہو جاتے ہیں۔

مجھے اس تاثر نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ بچپن میں، میں نے جنوں اور پریوں کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ ان میں کوئی مخلوق جادو کے ذریعے دوسرے کو قابو میں کر لیتی۔ پھر اسے حصار سے نکلنے کی شرطیں طے ہوتیں۔ بالکل اس طرح پری نے مجھے بوتل میں بند کر دیا۔ میں اس کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا اور بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک اس تاثر کو کوئی نام نہ دے لوں گا، پری کو مختلف پیش کش کرتا رہوں گا۔

''یہ تنخواہ مجھے اس حالت میں قبول ہے کہ میں شام کو گھر چلی جایا کروں۔'' اس وقت، میں صرف یہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے ہاں ملازمت کے لیے رضامند کر لوں۔ میں نے اس کی شرط قبول کر لی اور اسے اگلے روز سے کام پر آنے کا کہا۔

اسی شام، میں فرزندِ قربان سے ملا۔ دو کمروں کا اپارٹمنٹ ہماری اجتماعی ملکیت تھا۔ وہاں ہم شام آٹھ بجے سے رات دو بجے تک بیٹھتے۔

میں ایک پلے بوائے مشہور ہوں۔ عورتوں کو جیتنا اور انہیں حاصل کرنا میرا مشغلہ رہا تھا۔ اس کھیل میں مجھے اتنا ہی مزہ آتا جتنا ایک گھاٹے والے معاہدے کو منافع بخش بنانے میں۔ گو اب میری عمر اتنی کم نہیں لیکن اپنے اس شوق سے میں لطف اندوز ہوئے جا رہا تھا۔ اس شام میری حالت ایک مدہوش نوجوان کی سی تھی۔ پری کو اپنے ہاں ملازمت دے کر میں نے اپنے تئیں ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ مجھے اپنی رگوں میں مچلتے خون کی گردش محسوس ہو رہی تھی۔ کیوپڈ کے تیر کا ایک نشانہ صحیح تھا۔ میں پوری دنیا کو اپنی اس خفیہ خوشی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ کائنات مجھے رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی تمام زندگی میں اس سے بڑا واقعہ کبھی نظر نہیں آیا۔ تاہم فرزند قربان پر اس اہم راز فاش کرنے میں مجھے ہچکچاہٹ تھی۔ ہم نے زندگی بھر ایک دوسرے سے کبھی کچھ نہیں چھپایا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فرزندِ قربان کو راز داں بنانا اس کے ساتھ پری کا حصہ بانٹنے کے برابر ہوگا۔ بے قراری میرے اندر موجزن تھی۔ میں نے ان لہروں کو خاموشی کے کناروں سے باہر نہ آنے دیا۔ ہم نے اس رات بہت کم باتیں کہیں۔ گلاس ہاتھوں میں تھامے ہم اس طرح بیٹھے رہے جیسے ان کی حفاظت پر مامور ہوں۔ میں فرزندِ قربان کے ذہن کو پڑھ سکتا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ ذات کا ہر ورق اپنے قریب ترین دوست پر بھی نہیں کھولنا چاہیے۔ صبح چار بجے ایک خاموش معاہدے کے تحت ہم دونوں اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مجھے یہ رازداری اچھی نہ لگی۔ فرزندِ قربان ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے میرا ساتھ دینے کے لیے زندگی کا اہم ترین حصہ گھر سے باہر گزار دیا تھا۔ اُسے ہمراز بنانے میں کسی منصوبے کا دخل نہیں تھا۔ میں نے صرف ایک جبلت پر عمل کیا تھا۔ مگر وہ میری اس خود غرضی کو سمجھ جائے گا!

میں جب گھر پہنچا تو رخشندہ میرا انتظار کرتے کرتے اس صوفے پر سو گئی تھی جہاں ہم رات دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبح جب معمول کے وقت آنکھ کھلی تو سر میں درد تھا۔ اس کی ہمیشہ سے دو وجوہات رہی تھی۔ زیادہ پی لینا اور کسی ذہنی الجھن میں گرفتار رہنا۔ میں نے سر درد کی پروا نہ کی اور تیار ہو کر دفتر کو چل پڑا۔ مجھے پری کو اپنے پاس لا کر اس کے پر کاٹنا تھے۔ اس کی پرواز کو محدود کر کے اُڑانیں ختم کرنا تھیں۔ پہاڑوں کے درمیان ایک جھیل ہو جہاں پری رہتی ہو۔ میں وہاں راتوں کو جاؤں۔ اسے جھیل کی لہروں پہ مچلتے دیکھوں۔ وہ بلند پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر ان کی ہنسی اُڑائے۔ میں اس کے قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکراتا جاؤں، یہاں تک کہ سردی آ جائے۔ جھیل کا پانی جم جائے۔ پہاڑ برف کی سفید چادر اوڑھے ہواؤں کا روپ دھار لیں۔ پری اپنے غار میں چلی جائے جہاں خوش گوار ہوائیں اسے گرم رکھے ہوں۔ وہ بغیر بازو والے لباس میں چہل قدمی کرتی نظر آئے۔ میں اسے دیکھتا رہوں، مشرق کی جانب سے آنے والے اُجالوں کے انتظار میں!

IV

پری میں کام کرنے کی بے انتہا صلاحیت تھی۔ وہ پہلے ہی دن سے کام میں اس طرح جٹ گئی جیسے برسوں کا بھوکا کھانے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اُس نے کمپیوٹر پر عبور حاصل کیا۔ عام آدمی جو کچھ مہینوں میں سیکھتا ہے وہ اُس پر ہفتوں میں حاوی ہو گئی۔ تحقیق شاید اُس کے خون میں تھی۔ پری نے اپنے شعبے کو نہایت چابک دستی سے سنبھالا۔ اس شعبے کے صرف تین افراد، دس آدمیوں کے مساوی کام کرتے تھے۔ پری کے مفصل تجزیے نہایت درست ثابت ہوتے تھے۔ پری کا کام اتنا جامع اور مکمل تھا کہ میں نے اُسے پروڈکشن کا شعبہ بھی دے دیا۔ وہ اور زیادہ تندہی کے ساتھ اپنی مصروفیات سنبھالنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ پری کا ذہن بہت منظم تھا۔ وہ ہر کام ایسے سلیقے سے کرتی کہ اُس پر اُنگلی رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ ریسرچ اور ڈویلپمنٹ میرا سب سے زیادہ فعال شعبہ بن گیا۔ مدمقابلِ صنعتوں کی خامیوں پر اپنی مصنوعات کی برتری ثابت کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ قیمتوں کے تجزیے اور صارفین کی نفسیات سے وہ پوری طرح آگاہ تھی۔ ان خوبیوں کی بنا پر میں اُسے اپنی ذمے داریاں سونپ کر ریٹائر ہونے کا بھی سوچتا مگر اُس کی شخصیت کو تھوڑا بہت سمجھتے ہوئے ایسا کرنا حماقت تھی۔ ایسے میں پری ہر شے پر قبضہ کر لیتی!

پروڈکشن کا شعبہ اُس کے حوالے کرنے کے ساتھ ہی میں نے پری کی تنخواہ میں دس ہزار روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں زندگی کی حرارت سے نمو پاتے اُجالے اور اندھیرے جالے سے بنتے گئے تھے۔ پھر اُن کی دم توڑتی شدت وہاں عارضی طور پر

بسیرا کر گئی۔ اس اجنبی جذبے کا عکس پری کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ وہ ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہونٹوں پر آتے آتے الفاظ کہیں اُس کی آنکھوں میں کھو گئے۔ مجھے وہ دھنک کے رنگوں کی طرح لگی جن کے ماخذ کہیں اور ہوتے ہیں۔

پری اور میں دو رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ میں تو صرف ایک ہی تعلق چاہتا تھا جسے اُس نے ناممکن بنا دیا۔ میں تو ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کو بند کرنے کو تیار تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ سارا دن میرے پاس بیٹھی رہا کرے۔ اُس کے اندر برتری حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ میں بعض اوقات اُس کے ولولوں سے خائف ہو جاتا۔ ایسی ہی ترقی کی شدت میرے جینز میں بھی تھی۔ میرے خاندان نے صرف مثبت نتائج نظر میں رکھے تھے جن کے حصول کے لیے اخلاقی یا قانونی پہلوؤں کو مدنظر نہیں رکھا گیا تھا۔ میں بعض اوقات پری کی اس انتہا سے خائف ہو جاتا۔ میرے ساتھ اُس کے رویے میں آغاز والی بے توجہی نہیں تھی۔ بعض اوقات وہ لطیف گفتگو بھی کرتی۔ میرے کسی ذومعنی فقرے سے لطف اندوز بھی ہوتی مگر اُس کا جواب اکثر مجھے لاجواب کر دیتا۔ اشاروں کنایوں میں متعدد بار باور کرایا کہ میں اُسے پسند کرتا ہوں۔ اس چاہت میں میری سرمایہ داری یا باس ہونے کو دخل نہیں تھا۔ اگر حالات اُلٹ بھی ہوتے، تب بھی میں اُسے چاہتا۔ ایسی بات سن کر اُس کی آنکھوں میں دھندسی چھا جاتی۔ وہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے کرسی پر ٹیک لگا لیتی۔ میں اس سے کئی نتائج اخذ کرتا۔ وہ اپنی خوشی کو چھپانے کے لیے ایسا کرتی ہے یا میرے اظہار سے بیزار ہو کر مایوسی چھپانے کے لیے ایسا کرتی ہے یا اُسے اس رشتے میں کوئی دلچسپی نہیں! کیا وہ صرف ملازمت جاری رکھنا چاہتی ہے!

اس طرح کے تاثرات رکاوٹ نہ بن سکے۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ مجھے پری کو اپنے جذبے کی صداقت کا یقین دلانا تھا۔ مجھے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ حالات کے بہاؤ کا رخ میری طرف ہے۔ صرف پری کی شادی کا خدشہ کبھی کبھی مجھے جھنجلاہٹ میں ڈال دیتا۔ میں اُس کے معاملات سے بخوبی واقف نہیں تھا۔ وہ ایک مستعد اور چوکس سپاہی کی طرح اپنی ذات کی حفاظت کرتی۔ میں نے کبھی بھی اُسے غلط تاثر

دیتے یا غیر ذمے دارانہ فقرہ کہتے نہیں سنا۔ اُس کی گفتگو سے میں نے اُس کے متعلق ایک دھندلا سا خاکہ بنایا ہوا تھا۔ اُس کا خاندان شہر میں ایک تنگ سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ صرف تین افراد تھے...... وہ اُس کا باپ اور دادی۔ اُس کی ماں کو فوت ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو دادی کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ اُس کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے پری خاصی پریشان رہتی تھی۔ اُس کا باپ ایک ریٹائرڈ آدمی تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد جسے کوئی ملازمت نہیں ملی تھی۔ خاندان معاشی طور پر کافی کمزور تھا۔ بظاہر گھر چلانے کی تمام تر ذمے دار پری تھی۔ اُس کا لباس، اُس کا رکھ رکھاؤ اور برتری کا احساس مجھے اکثر الجھن میں گرفتار کر دیتا۔

اعلیٰ تعلیم اور خود نمائی ایسے عوامل تھے جن کی سوئیاں مجھے چبھتی رہتیں۔ میں اکثر سوچتا کہ یہ سب کچھ اُس نے کہاں سے لیا؟ ایسا تو نہیں کہیں...... کوئی...... اس سے آگے میں سوچنا بند کر دیتا۔ اس قسم کے تمام خیالات کے باوجود میرا ذہن کئی حقائق کو قبول نہیں کر رہا تھا۔

ان پس منظری حالات کی روشنی میں اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ شفقت کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ نچلے درمیانی طبقے کی لڑکیوں میں تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہیں کہ غربت کی لکیر کو تعلیمی اہلیت کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طبقے کے لڑکوں میں ایسا شعور نہیں ہوتا۔ وہ اپنا قیمتی وقت اِدھر اُدھر کی محفلوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کی اکثریت میں ترقی کا جذبہ مفقود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ذات پات کے کڑے نظام میں بندھے ہوتے ہیں، اور اپنی برادری کی پڑھی لکھی، برسرِ روزگار لڑکیوں سے شادی کروانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ مگر پڑھی لکھی لڑکیوں کا ایسے لڑکوں کو رد کر دینا ایک قدرتی سی بات ہے۔ چنانچہ مجھے یقین سا تھا کہ پری کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ یہ سب تو ایک ذاتی تجزیہ تھا لیکن پری کا لباس، اُس کی تعلیم اور خود اعتمادی پیدا کرنے والے عوامل ستاتے رہتے۔ اُس کے پیکر سے مجھے پاکیزگی ٹپکتی نظر آتی۔ میں اُسے کسی غیر اخلاقی یا سماجی گناہ میں الجھی ہونے کا سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اُس نے اپنے سحر میں لے رکھا تھا۔ لیکن چند حقائق ایسے تھے جن کے بارے میں جاننا ضروری تھا۔ خود سر اتنی تھی کہ میں اُس سے پوچھتا تو وہ یقیناً نوکری چھوڑ جاتی۔ وہ میرے لیے معمہ بنے جا رہی تھی۔ ملازمت کے پہلے چند مہینوں میں اُسے قریب رکھنے کے لیے میں نے کہا کہ وہ تنخواہ اکاؤنٹینٹ سے وصول کرنے کے بجائے میرے دفتر سے آ کر لیا کرے۔ وہ وقتِ مقررہ پر پہنچ جاتی اور بہت روکھے انداز میں تنخواہ کا مطالبہ کرتی۔ نوٹوں کو کم از کم تین مرتبہ گنتی۔ اس رویے سے ظاہر کرتی کہ شاید ایک آدھ نوٹ کم ہے۔ ممنونیت کی کوئی شکن اُس کے چہرے پر عیاں نہیں ہوتی حالانکہ عملے کا ہر فرد تنخواہ وصول کرتے ہی اکاؤنٹینٹ کا شکریہ ادا کرتا ہے!

میرے دفاتر میں اوقاتِ کار کا پابند رہنا اور کام میں مستعدی دکھانا ہر ملازم کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ عملے کے ملاقاتی اُنہیں صرف کھانے کے وقفے کے دوران میں مل سکتے ہیں، کسی کو دفتروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ خلاف ورزی کی اطلاع مجھے فوراً دی جاتی ہے جس پر میں پابندی نہ کرنے والوں کے ساتھ کافی سختی سے نپٹتا ہوں۔

مجھے بتایا گیا کہ پچھلے چند دنوں سے ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی پری سے آ کر ملتا ہے۔ دونوں ایک کونے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مقررہ وقت پر وہ آدمی چلا جاتا ہے۔ متعلقہ لوگوں کو اتنا ہی پتا تھا کہ اُس کا نام ابرار ہے۔ مجھے تشویش سی ہوئی اور اندیشے درست لگے۔ اُس وقت میں دفتر میں اکیلا تھا، میری پریشانی کی انتہا نہ رہی تھی۔ منہ میں کسیلا پن در آیا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بس ٹپکنے ہی کو تھے۔ میں اپنے والدین کے مرنے پر بھی رویا نہیں تھا۔ باپ کی وفات پر آنسو نہ بہانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میں بہت بڑی جائیداد کا وارث تھا۔ لیکن یہ کیا کہ ابرار اور پری کی ملاقات پر رونے کو تیار ہو جانا؟ کوئی شے میرے گلے میں اٹک گئی تھی۔ میرا بدن پسینے سے تر تھا۔ میں اپنے جسم سے ایک ناخوشگوار بو نکلتی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے دفتر میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد میرے خون کی گردش معمول پر آ گئی۔ میرے ذہن سے الجھنوں کی دھند چھٹنا شروع ہو گئی۔ بتدریج شکلیں صحیح نقوش کے ساتھ نظر آنے لگیں۔ میں نے ابرار اور پری کے تعلقات کی نوعیت معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سوچا کہ کسی طرح ابرار سے ملاقات کروں۔ اس کام کے لیے شفقت نہایت موزوں تھی۔ اُسے راز دان بنانا پڑے گا جس دن ابرار آئے وہ پری کو کسی کام میں الجھائے رکھے اور اُسے میرے دفتر میں بھیج دے۔ مجھ میں ایسی الجھنوں سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت موجود تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے مقام اور حیثیت کی بنا پر ابرار میرے لیے کوئی مشکل مرحلہ ثابت نہیں ہوگا۔

V

انٹرکام استعمال کرنے کے بجائے میں نے شفقت کو چپڑاسی کے ذریعے بلایا۔

جب وہ دفتر میں آئی تو میں نے اپنے آپ کو کچھ کاغذات دیکھنے میں مصروف کیا ہوا تھا۔ اتفاق سے اُسی وقت موبائل پر فرزندِ قربان کی کال آ گئی۔ بے مقصد سا فون تھا۔ میں نے گفتگو ذرا طویل کردی تا کہ شفقت کو کچھ انتظار کرنا پڑے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ میرے ادارے کے لیے بہت اہم تھی لیکن اُس وقت میں اُس کی اہمیت کم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُسے کچھ لمحے انتظار کرایا۔

"شفقت! بیٹھو"۔ میں نے اُسے کبھی بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ میرے لہجے میں کہیں سے اتنی مٹھاس آ گئی تھی کہ شفقت کو میں اگر کھڑکی سے چلانگ لگانے کو کہتا تو وہ یقیناً ایسا کر جاتی۔ میں نے اپنی آواز میں شہد کی مقدار اور بڑھادی۔ شفقت کرسی کے کونے پر سرک آئی۔ میں اُس کی توجہ کو مکمل طور پر گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"شفقت! میں کمپنی کے مستقبل کے بارے میں ایک اہم بات جاننا چاہتا ہوں۔"

شفقت کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے۔ اُس کی آنکھوں میں تجسس کی جگہ دانائی نے لے لی۔

"میں آپ کے اعتماد کی قدر کرتی ہوں۔" ایک پر اعتماد مشیر کی وفاداری اُس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

"زہرہ جبیں کمپنی کے لیے کسی حد تک ناگزیر ہوگئی ہے۔ اُس نے تھوڑے ہی عرصے میں ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ ضرورت آن پڑی ہے کہ اُس کی حفاظت کی جائے۔" میں رکا۔ شفقت پنچ لائین کے انتظار میں تھی۔

"مجھے اہم اطلاعات کی ضرورت ہے جسے تم پورا کرسکتی ہو۔" میں دوبارہ رکا۔ شفقت پیڈ پر پنسل سے لکیریں بنا رہی تھی مگر اُس کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔

"ابرار صاحب تقریباً روزانہ یہاں آ رہے ہیں۔ تم زہرہ جبیں اور اُن کے تعلق کے بارے میں کیا جانتی ہو۔" میں بہت احتیاط سے بات کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں زہرہ جبیں بالکل محو ہو چکی تھی۔ وہاں صرف پری کا بسیرا تھا۔ کسی لمحے کی انتہائی غیر اہم لاپرواہی زہرہ جبیں کو پری بنا کے میرے اس ایکٹ کو تباہ کرسکتی تھی۔

"سر! زہرہ جبیں اپنے بارے میں بہت کم بات کرتی ہے۔" میں مکمل طور پر متفق تھا۔

"بشریٰ اور کچھ دوسری مشترک دوستوں کا خیال ہے کہ زہرہ جبیں اور ابرار ایک دوسرے کو۔" شفقت رُکی۔

"پسند کرتے ہیں۔ یہ تعلق نیا نہیں ہے۔ زہرہ جبیں کی عمر اس وقت تقریباً تیس برس ہے۔" کاغذوں کے مطابق وہ پورے تیس کی تھی۔ میں دو سال کی اور گنجائش دینے کو تیار تھا۔ لڑکیوں کی عمریں ہمیشہ کم لکھوائی جاتی ہیں۔

"ابرار صاحب شادی شدہ ہیں۔ اُن کا بیٹا کالج میں اور تین بچے ہائی سکول میں ہیں۔ وہ ایک کامیاب کاروبار کے مالک ہیں۔ مالی طور پر خاصے آسودہ ہیں۔ زہرہ جبیں اور اُن کی پہلی ملاقات کو نداز اً بارہ برس کا عرصہ ہونے کو آیا ہے۔ اُس وقت ابرار صاحب کی شادی کو چار سال ہوئے تھے۔" میں اپنے اندر تلخی محسوس کرسکتا تھا۔ کیا ہر شادی چار برسوں کے بعد کایا پلٹتی ہے۔؟

"ابرار صاحب کا زہرہ جبیں کے ہاں آنا جانا اس سے پہلے کا تھا۔" معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ ابرار جھولنا جھپٹنے والا ہے۔

"ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے گزارے کے لیے پنشن کے صرف چند سو روپے تھے۔ ابرار

صاحب نے زہرہ جبیں کے والد کو اپنا اڈہ مینجر بنا دیا۔ اُن کی چند ویگنیں اور چھوٹا سا اڈہ ہے۔‘‘ یہ غالبًا اُن بڑے اخراجات پر پردہ ڈالنے کے مترادف تھا جو ابرار صاحب زہرہ جبیں کے لیے برداشت کر رہے تھے۔

’’یہ کب کی بات ہے؟‘‘ میں شفقت سے پہلی دفعہ مخاطب ہوا۔

’’تقریبًا وہی دور ہے جب زہرہ جبیں اور ابرار صاحب کے...... تعلق کے بارے میں دوستوں اور شناساؤں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔‘‘ میرے ذہن نے ابرار کو پری کے گھر بیٹھنے کی تصویر بنائی۔ گو میں نے ابھی تک اُسے دیکھا نہیں تھا، پھر بھی ایک تصور سا تھا۔ وہ چائے کی پیالی ابرار کو تھمانے آئی۔ پیالی پکڑتے ہوئے ابرار نے پہلی دفعہ اُسے دیکھا۔ وہ کھِلتی کودتی کم عمر لڑکی کے بجائے ایک جوان عورت تھی۔ چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹتے بچی۔ ابرار نے پہلی دفعہ پری کو بھتیجی، بھانجی یا بیٹی کے بجائے ایک عورت کے پیکر میں دیکھا۔ وہ سکتے میں آ گیا۔ اُس کی عنایات نے پہلے دادی پھر باپ اور آخر میں پری کو بے بس کر دیا ہوگا۔

’’اُنھوں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ وہ کھلم کھلا ملتے تھے۔ زہرہ جبیں ابرار صاحب کے ساتھ کار میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھتی۔‘‘ میں نے سوچا کہ وہ ضرور کسی محفوظ جگہ پر خفیہ ملاقات کے لیے جاتے ہوں گے۔ میرے منہ کا ذائقہ پھر کڑوا ہو گیا۔

’’زہرہ جبیں مہنگے لباس پہننے لگی۔ اُس کی وجہ وہ کسی جائیداد کی فروخت بتاتی ہے...... پچھلے کچھ عرصے سے اُن میں اختلافات ہیں۔ دیکھنے والے محسوس کر سکتے ہیں کہ ابرار صاحب، زہرہ جبیں کو کچھ باور کرانے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی سے کسی طرف دیکھتی رہتی ہے۔‘‘ پری عدم دلچسپی کا اظہار ایسے ہی کرتی۔

’’اب اُن کے تعلقات کس ڈگر پر ہیں۔‘‘ میں نے پنچ لائین پھینک دی۔ شفقت نے اپنی پیشہ ورانہ نظر کے بجائے مجھے کسی اور طرح سے دیکھا۔ میں اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ سکتا تھا۔

’’سر! ایک بات میں بتانا چاہوں گی۔ زہرہ جبیں بہت مستعد کارکن ہے۔ ذاتی طور پر وہ فلرٹ لڑکی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ رہی بات ابرار صاحب کی تو بشریٰ مجھے بتا رہی تھی کہ اُس نے ماضی قریب میں ابرار صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ صرف کبھی کبھار اُن کی خود غرضی اور مکاری کی بات کرتی ہے۔‘‘ میں نے سوچا، اگر وہ فلرٹ ہوتی تو میری رغبت کا مثبت جواب دیتی۔ سب سے زیادہ لطف تو کمپنی کے سربراہ کے ساتھ کھیل میں تھا۔ ماضی کی بند آنکھ میں اگر ابرار صاحب کی مکاری چبھ رہی تھی تو اس کی یقینًا کوئی وجہ ہوگی۔ میرے پیشے کے لوگ سفید پوشوں کو سہارا دینا معاشرتی بہبود سمجھتے ہیں۔ ایسے کام میں اُن کے افرادِ خانہ تک بھی رسائی پا جاتے ہیں۔ لوگوں میں بیٹھ کے اپنی بڑائی بیان کر کے اگر کوئی معمر شخص کسی خاتون کو جیت لے تو اِس ثواب کا صلہ!

اب غالبًا پری کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کا مقام، قابل رشک اور تنخواہ معقول تھی۔ پری کے مزاج کو جانتے ہوئے میں سوچ سکتا تھا کہ اُس کا ابرار صاحب سے آنکھیں پھیر لینا کوئی عجب بات نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ شفقت اپنی بات ختم کر کے انتظار میں تھی۔

’’اگلی دفعہ جب ابرار صاحب آئیں تو انہیں میرے دفتر میں لے آنا۔ زہرہ جبیں کو کسی کام میں الجھائے رکھنا۔‘‘ میں نے شفقت کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اس فیصلے سے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

مجھے ایک مشیر بھی مل گیا تھا۔

چند ہی دن بعد ابرار سے میری ملاقات ہوگئی۔

میں دفتر میں اسے میز کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ اُس کا قد چھوٹا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ وہ نظر کی عینک ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ پریشانی اور جرات اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ میرے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ عینک ناک پر رکھنے کے بعد وہ لگاتار اپنے ہاتھ ملتا رہا۔ میں کرسی سے کئی صدیوں کا فاصلہ طے کر کے اُٹھا۔ اجنبیوں سے ملاقات کے وقت میں اپنے چہرے پر ایک دلکش اور محبت بھری مسکراہٹ لے آتا ہوں۔ مسکراہٹ میں بظاہر کوئی ریا نہیں ہوتی مگر اس میں چھپی مکاری کو تلاش کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ ابرار نے میرے بڑھے ہاتھ کو اپنی گرفت

میں لے لیا۔ اُس کے ہاتھ کافی بڑے تھے اور مصافحے میں گرم جوشی تھی۔ ان دونوں چیزوں سے میں حیران ہوا۔

ہم نے ایک دوسرے کو نظروں سے تولا۔ مجھے وہ ہلکا سا محسوس ہوا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اُس کے چہرے پر ایک دم اطمینان کا عکس آ گیا۔ وہ نزدیک ترین کرسی میں دھنس گیا۔

''آپ کو زحمت دی!'' میں نے اعتماد سے کہا۔ یہ نفسیاتی کشتی تھی۔

اُس کے ہونٹوں کے کونے تھرتھرائے۔ میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا:

''جس طرح آپ نے زہرہ جبیں کی تربیت کی وہ قابلِ تعریف ہے۔'' میری بات میں چھپا تیر صحیح نشانے پر لگا۔ اُس نے کرسی پر اپنی جگہ بدلتے ہوئے ایک دم مجھے دیکھا۔ میں نے ابرار کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''آپ اُس کی حوصلہ افزائی کرتے رہا کریں۔ وہ اگر اسی لگن سے کام کرتی رہی تو نہ صرف اپنے لیے بلکہ آپ لوگوں کے لیے بھی نام پیدا کرے گی...... ویسے آپ اس کے لگتے کیا ہیں، چچا یا......؟'' میں نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اُس کے چہرے پر کئی رنگ آئے۔ وہاں غصہ بھی تھا اور حیرانی بھی۔ وہ کرسی سے اُٹھنے کے لیے تیار ہوا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ وہ پھر ساکت ہو گیا۔

''آپ لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں کیا؟ میں زہرہ جبیں کو بلاتا ہوں۔ ہم چائے کی ایک ایک پیالی پئیں گے اور باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔'' میں نے انٹرکام پر شفقت سے پری کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد آ گئی۔ اُس نے کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اُس کی آنکھوں نے کھچاؤ کا عکس جذب کر لیا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

''نہیں۔'' اُس کا لہجہ بہت سرد تھا۔

پریؔ نے ابرار کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کی نظریں مجھ پر آ کر ٹھہر گئیں۔ اُس وقت ان میں کوئی شناسائی نہیں تھی۔ اُن میں کسی جرم میں اُلجھائے گئے بے گناہ کی سی جارحیت تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تمام معاملہ کافی مضحکہ خیز تھا۔

''چلیئے۔'' اُس نے سختی سے کہا۔

وہ ایک جست میں ایسے کھڑا ہو گیا جیسے اس کی سیٹ میں کھٹمل تھے۔ پری نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ابرار فوراً باہر نکل گیا۔ وہ دروازے میں مڑی۔ اُس کے ہونٹوں پہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ کچھ لمحے وہاں کھڑی مسکراتی رہی۔ میں اُس مسکراہٹ کی تاب نہ لا سکا اور دھڑام سے کرسی میں گر گیا۔ اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ قہقہہ آدمی اگر رات کے وقت سنے تو لازماً گھر سے ویرانوں اور وہاں سے پھر گھر کی جانب بھاگ اُٹھے۔ اُس رات میں نے سارا ماجرا فرزندِ قربان کے سامنے رکھ دیا۔ پیالے نے میرے اعتراف کو آسان بنا دیا تھا۔ پچھلے کئی مہینوں کا لاوا میرے اندر دبا ہوا تھا۔ اب جو پھٹنا شروع ہوا تو مجھے بھی ساتھ بہاتا چلا گیا۔ فرزندِ قربان خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے اندر جیسے کوئی بھوت پریت سما گیا ہو۔ میں بولتا گیا، جزئیات تک بیان کر دیں۔ اپنے تمام خدشات اُس پر ظاہر کیے آج کی شکست کا بھی اعتراف کیا۔ شدتِ اظہار سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ وہ بہت دیر خاموش بیٹھا رہا۔ آخر بولا! ''میں کچھ عرصے سے تمہارے رویے اور اطوار میں تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کئی اندازے لگائے۔ میں اگر ایک مشورہ دوں تو برا نہیں مانو گے!'' اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''کہو۔''

''تم اس لڑکی کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کے بھول جاؤ۔'' اُس نے مجھے گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

''فرزندِ قربان! تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں۔ وہ بنی ہی محبت کرنے کے لیے ہے۔ میں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔''

''تم اسے پا کر کیا کرو گے۔؟''

''یہ بعد کی بات ہے۔ فی الحال میں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔'' میں تقریباً چیخ رہا تھا۔

''کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم نے اُسے کھو دیا ہے۔'' فرزندِ قربان ہمیشہ کی طرح دلائل پہ تلا ہوا تھا۔

''تم نے اُس کی وہ نظر نہیں دیکھی۔ تمہیں قہقہے سے برستی وہ نفرت کیسے سنائی دے سکتی ہے!

وہ ایک پیغام تھا۔ مجھے کہا گیا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھو، میں ابرار کی ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ اُس نے مجھے چھوڑنا ہے تو اپنی مرضی سے چھوڑے۔ ابرار کے لیے میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

میرا سانس پھر پھول گیا۔ فرزندِ قربان اپنے گلاس میں جھانکتا رہا۔ شاید اُس کے تمام دلائل وہاں سے اُبھر رہے تھے۔

"ایک اور مشورہ!" وہ مسکرایا۔ مجھے اُس کی خوا اعتمادی پسند نہیں آئی۔

"بکو!" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"تم اُسے بھولنے کی کوشش کرو۔" میں تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں بے بسی کے عالم بیٹھ گیا۔ میری حالت وہی تھی جو صبح ابرار کی تھی۔

"دفتر میں وہ تمہیں روز نظر آئے گی۔ ایک حل یہ ہے کہ تم اُسے ملازمت سے فارغ کردو۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ میرے اندر بس گئی ہے، جس طرح میری رگوں میں خون یا وجود میں زندگی ہے۔ اُسے جدا کرنا میری موت ہوگی۔ یہ مرنا شاید جسمانی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے میں ایسی موت مرجاؤں جو اس سے بھی ابدی ہو۔"

"تو پھر تم ایک مہینے کے لیے کہیں دور چلے جاؤ۔ تمہارا کسی کے ساتھ کوئی رابطہ نہ ہو۔ تم زہرہ جبیں سے الگ ہو کے خود کو تلاش کرو۔ شاید اس تنہائی کے جنگل میں وہ کہیں کھو جائے اور تمہیں اپنا وجود مل جائے!"

"تمہیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا۔ "ایسے نہیں جیسے تمہاری حالت ہے۔ صرف مختصر وابستگیاں جو غیر اہم سی دلچسپی کے سوا کچھ نہیں تھیں۔"

اس وقت جتنا اُسے پانا مشکل نظر آرہا ہے اس سے زیادہ اُسے بھولنا مشکل ہے۔ پھر بھی تمہاری تجویز پر عمل کروں گا۔ شاید اُسے جیتنے کا کوئی راستہ نکل آئے ...... میں کل ہی ناران، شوگران

اور تھیا گلی کی طرف نکل جاؤں گا۔"

"تم نے ہمیشہ زندگی کی ہر مشکل کو اپنے لیے آسان بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے اس معاملے کو بھی تم اسی تدبر سے حل کرو گے۔" فرزندِ قربان نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ اس کی بات سے اپنے اندر اعتماد بحال ہوتا محسوس ہوا۔ مجھے دوسری طرف روشنی تو نظر نہیں آئی لیکن غار کی تاریکی میں کمی ضرور محسوس ہوئی۔ میں بغیر ٹھوکر کھائے چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔

ہم کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک مشترک خاموشی سے ہم دونوں محوِ کلام تھے۔ میں کمرے میں روشن قمقموں کی گفتگو سمجھ رہا تھا۔ ایئر کنڈیشنر کی خاموش آواز میں بھی شامل تھا۔ ٹرالی میں آدھی خالی بوتل کے بھرے حصے سے پھوٹتی مسکراہٹ میری اپنی تھی۔ سامنے بیٹھے فرزندِ قربان کی جسمانی گفتار میری خاموش زبان کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ مجھے ہر طرف اپنی ذات رقصاں محسوس ہوئی۔ صبح کی شکست کو فتح میں تبدیل کرنے کا ارادہ مضبوط ہونا شروع ہو گیا۔ اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی ضرورت تھی۔ خون کی گردش بحال رکھنے کے لیے میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ فرزند قربان نے آنکھ اُٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ وہ مجھے اس ذاتی جنگ میں اپنے ہتھیاروں سے لڑنے دینا چاہتا تھا۔ فتح حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے میدان چن دیا تھا۔ میں بھی جنگ کے لیے تیار تھا۔ پری کو اپنے ذہن سے بالکل خارج کردوں گا۔ وہ میرے دفتر میں کام کرتے ہوئے بھی ایک غیر اہم سے پرزے کی طرح ہوگی جسے تبدیل کیا جاسکتا ہے یا اتنی شدت سے اس کا ہو جاؤں گا کہ سب کچھ قربان کردوں گا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ سب سے واضح مثال انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کی ہے جس نے ایک عام سی عورت کے لیے برطانیہ کا تخت چھوڑ دیا تھا۔ اس عورت کو شاید تاریخ موزوں مقام میں دے سکی۔

میں جب بھی دفتر سے طویل غیر حاضری کروں، اہم معاملات نمٹانے کو ایک بورڈ تشکیل دے دیا کرتا ہوں۔ اس بورڈ میں شفقت، چیف اکاؤنٹنٹ، تینوں فیکٹریوں کے جنرل مینیجر، برآمد اور درآمد کے شعبوں کا سربراہ اور بنک سے متعلقہ بینک و فنانس پریذیڈنٹ شامل ہوتے ہیں۔

فیصلوں کا اختیار شفقت کو ہوتا ہے۔

میں نے اگلے دن بورڈ کی میٹنگ بلائی جس میں پری کو بھی شامل کیا گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ اہم شعبے کی سربراہ تھی اور دوسرے میں اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا۔ بورڈ کو بتایا گیا کہ میں ایک مہینے کے لیے غیر حاضر رہوں گا۔ میرے ساتھ کسی قسم کا رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ اخباروں کے ذریعے میں حالات جانتا رہوں گا۔ اگر کوئی خلافِ توقع واقعہ پیش آ جائے تو بھی متعین عرصے سے پہلے میرے لوٹنے کا کوئی امکان نہیں ہوگا اور روزانہ کے فیصلوں میں شفقت پری سے مشاورت کیا کرے گی۔

یہ بھی ایک تدبیرانہ چال تھی۔

حمیدی

VI

پہاڑوں سے میری شناسائی نہیں تھی۔ میں نے انہیں دیکھا ضرور تھا مگر سطحی طور پر! میرے لیے وہ اتنے ہی غیر اہم تھے جتنی کہ ایک بیمار صنعت۔ کبھی کبھار وہاں چلا جاتا، ایک آدھ دن گزارنے کے بعد اُکتاہٹ کا بوجھ اُٹھائے واپسی کا سفر اختیار کر لیتا۔ مجھے وہاں ہمیشہ گھٹن کا احساس ہوتا۔ بلند و بالا پہاڑ اپنی طرف بڑھتے محسوس ہوتے۔ ایک واہمہ سا دل میں گھر کیے رہتا کہ میری ذرا سی غفلت پر وہ میرا گلا دبا دیں گے۔ یہ بلندی کا خوف تھا یا کوئی نفسیاتی الجھن مجھے گھیرے ہوئے تھی! میرے اندر کامیابی حاصل کرنے کی شدید خواہش رہتی۔ میں جب بھی کسی سے ملتا، اسے نظروں سے ایسے ہی زاویے سے تولتا۔ اسی جذبے کے تحت پبلک سکول میں باکسنگ سیکھی، گھڑسواری بھی اسی کی توسیع تھی۔ میں خود کو پہاڑوں کے سامنے بےبس پاتا۔ مجھے وہ ہمیشہ ناقابلِ تسخیر لگتے۔ چنانچہ میں ان سے دور رہا۔ پہاڑوں کی بلندی میں مجھے ایسا غرور نظر آتا جسے میں شکست نہیں دے سکتا تھا۔ یہ گمان رہتا کہ وہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ پتھروں سے بت تراشے جا سکتے ہیں لیکن ان سے ٹکرایا نہیں جا سکتا۔ جن لوگوں نے چٹانوں کی بدصورتی اور ہیبت کی پروا کیے بغیر ان میں سے مجسموں کے موتی ڈھونڈے، قابلِ رشک ہیں۔ وہ پتھروں پر اپنی نازک خیالی کے کبھی نہ ٹوٹنے والے ہتھیاروں سے لیس ہو کر حملہ آور ہو گئے۔ میرے اندر ان سے ٹکرانے کی اہلیت نہیں تھی۔

ان تحفظات کے ساتھ میں پہاڑوں کی سمت چلا۔

مجھے کسی جزیرے کی طرف جانا چاہیے تھا۔ پانی پہاڑوں کے بالکل اُلٹ ہے۔ وہ ان کی طرح غیر لچک دار نہیں ہوتا۔ اسے اپنے وجود کی بقا سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ سمندر میں اس کا رنگ اور کردار ایک نوعیت کا تو دریا میں کسی اور طرح کا ہوتا ہے۔ نہروں اور کھالوں میں وہ زندگی کو جلا بخشتا ہے۔ پہاڑوں میں اس کی روانی بچوں کی جولانی کی طرح ہوتی ہے تو میدانوں میں بڑھتی عمر کا ٹھہراؤ لیے۔ پانی کی کئی شکلیں اور روپ ہیں۔ اس کا اُبال بھی تخلیق کے عمل کو آگے چلاتا ہے۔

گو میں ہر قسم کا چیلنج قبول کر لیتا ہوں لیکن اس وقت میری ذہنی کیفیت تقابل کی نہیں تھی۔ مجھے تنہا رہ کر اپنی الجھن کا حل تلاش کرنا تھا۔ مجھے اپنی اس حالت میں پہاڑوں سے سمجھوتا کرنا ہی واحد حل نظر آیا۔ میں ان کے قریب ہونا شروع ہو گیا۔ ہم سارا دن اکٹھے گزارتے۔ آغاز میں ہمیں ایک دوسرے سے جھجک محسوس ہوئی۔ میرے تحفظات کی طرح انہیں بھی کچھ خدشات تھے۔ مجھے غالباً انہوں نے کوئی مہم جو سمجھ لیا جو انہیں تسخیر کرنے آیا تھا۔ میں نے ان کے رویے میں ایک گونہ جارحیت محسوس کی۔ پہاڑوں کی تکمیل میں کچھ اور اجزا بھی شامل تھے...... بلند درخت، نرم گھاس، رنگ برنگ پھول، تتلیاں اور پرندے اور اونچی سطح مرتفع پر جھلیں انہیں مکمل کرتی ہیں۔ میں نے جب بھی کسی درخت کو چھوا، ہواؤں میں اس کی برہمی کی پھنکار سنائی دی۔ گھاس پر میرے قدم پڑتے تو میں اس کی کراہ خاموشیوں کو توڑتی محسوس کر سکتا تھا۔ پھولوں، تتلیوں اور پرندوں کا رویہ میرے ساتھ غیر دوستانہ تھا، وہ آنکھیں بند کر لیتے یا کسی اور سمت کا رخ کر لیتے۔ پانی گرچہ پہاڑوں کے بالکل اُلٹ ہوتا ہے لیکن جھیلوں کے پانی میں ان کا عکس تھا۔

مجھے پہاڑوں سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

میں ادن ان کے درمیان گزارتا۔ گہراؤ میں پڑی وادیاں کشش لیے ہوئے تھیں۔ ڈھلانوں پر اُگے درخت نیچے تک چلے گئے تھے۔ اوپر سے وہ سر ملائے کسی سازش میں مصروف نظر آتے۔ ان کے اوپر بادلوں کی ہلکی سی چادر اسرار میں اور اضافہ کر دیتی۔ چند ہی دنوں میں مجھے ان کی جارحیت میں کمی نظر آئی۔ ان کے لب و لہجہ میں اپنائیت کی خوشبو تھی۔ بتدریج وہ میرے قریب آنا شروع ہو گئے۔ ہم نے اپنی زبان ایجاد کر لی۔ وہ اور میں ایک دوسرے سے محوِ کلام رہنے لگے۔ ان کے لہجے میں محبت کی مٹھاس تھی۔ میری تنہائی ختم ہو گئی۔ شاید میں بھی پھولوں کی طرح رنگین ہو گیا تھا کہ تتلیاں میرے اوپر بیٹھنا شروع ہو گئیں۔

میں زندگی میں اتنا پیدل کبھی نہیں چلا تھا۔ پہاڑوں میں اتنا محو ہو گیا کہ مجھے اور کچھ یاد ہی نہ رہا۔ ان میں ایسی تاثیر تھی کہ میں خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر پہلے سے زیادہ طاقتور محسوس کرنے لگا۔ مجھے تاریخ سے بہت رغبت تھی مگر جوانی کی دلچسپیوں اور بعد کی مصروفیتوں کی وجہ سے اس کا مطالعہ ترک کرنا پڑا۔ میں نے سوچا اب میرے پاس اس دلچسپی کی تجدید کے لیے وقت تھا۔ میں نے راولپنڈی فون کر کے خصوصی کوریئر کے ذریعے کافی کتابیں منگوا لیں۔ میں چوٹیوں پر، کبھی وادیوں میں، کبھی رات کو کمرے میں تو کبھی صبح لان میں پڑھتا۔ پہاڑ مجھے مصروفِ مطالعہ دیکھتے، میں نے محسوس کیا کہ انہیں میری بے اعتنائی پسند نہیں آئی۔ چناں چہ میں نے باآواز بلند پڑھنا شروع کر دیا۔ پہاڑ غور سے سنتے۔ ان کی یکسوئی دیدنی تھی۔ وہ ہزاروں سال سے اپنی جگہ پر کھڑے تاریخ کے گواہ تھے۔ بعض باتیں انہیں ناگوار بھی گزرتیں لیکن انہوں نے کبھی واضح اشارہ نہیں دیا۔

پہاڑ اور میں تاریخ کا حصہ بن گئے۔

پہاڑ اپنی ہستی کے صفحے آہستہ آہستہ کھولنے لگے جنہیں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا گیا۔ پری میرے ذہن سے نکل چکی تھی۔ تاریخ کے ایک دلچسپ واقعہ نے اُسے میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ تیمور لنگ نے ہندوستان میں ہاتھی کی سواری کی خواہش کا اظہار کیا۔ فیل بان نے ہاتھی کو چلا دیا تو تیمور نے اس کی باگ مانگی۔ اسے بتایا گیا کہ ہاتھی کو فیل بان چلاتا ہے۔

"جس سواری کی باگ میرے ہاتھ میں نہیں میں اس پہ نہیں بیٹھ سکتا۔" یہ کہتے ہوئے تیمور نیچے اُتر آیا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا، پری کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟...... دادی، باپ، ابرار، کوئی اور ہستی جسے میں نہیں جانتا یا کسی کے پاس بھی نہیں؟ تیمور لنگ کی بات میرے دل میں اُتر گئی تھی۔ پری اسی کی تھی جو اسے قابو میں کر لے۔ اس پر غلبہ پانا ضروری تھا۔ پہاڑوں نے مجھے انتظار کا حوصلہ دیا کہ وہ بھی کائنات کے ارتقا میں منتظر کھڑے ہیں۔ شاید یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا مگر انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ وقت کی حدیں میرے پاس تھیں۔ میں بھی پہاڑوں کی طرح انتظار کرنے کو تیار تھا۔

VII

میں نے راولپنڈی سے شفقت کو اپنے آنے کی اطلاع کردی تھی۔

رات کو میں گھر دیر سے پہنچا، اس لیے فرزندِ قربان سے ملاقات نہ ہوئی۔ صبح معمول کے وقت دفتر پہنچا۔ میں نے شفقت کے کمرے والا دروازہ استعمال نہیں کیا۔ مجھے عمارت کی ہر چیز ایک شفاف ترتیب میں لگی، اس کی وجہ غالباً میرے اندر کی تبدیلی تھی۔ ایک مہینے کے چلّے نے میرے راستے روشن کردیے تھے۔ مجھے چیزیں صاف اور اصلی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا اور پری اندر آئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ رکی، ہماری نظریں چار ہوئیں، دروازہ بند کرتے ہوئے وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک گھٹی سی خوشی کی چیخ نکلی۔ وہ میز کے دوسری طرف بے بس کھڑی ہوگئی۔ اگر میز بیچ میں نہ ہوتی تو وہ یقیناً مجھ سے لپٹ جاتی۔ اس کی آنکھوں کی چمک یک دم مرطوب ہوگئی۔ اس کی سانس تیز تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہاڑوں نے مجھے ضبط سکھایا تھا۔ میں رسماً مسکرایا۔

”کیسی ہو!“

”آپ دیکھ سکتے ہیں۔“ اس کی ہلکی سی مسکراہٹ میں اعتراف کا تذبذب تھا۔

میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ بے چینی میں ہلکے ہلکے قہقہے لگائے جا رہی تھی، میں نے مداخلت نہیں کی نہ جانے کتنے عرصے کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا!

”آپ کیسے ہیں؟ بہت فٹ نظر آرہے ہیں۔“ اس کی باتوں سے میٹھے بلبلے اُٹھ رہے تھے۔ پھر وہ اچانک اُداس چپ کے بوجھ تلے دب گئی۔ مجھے چہرے کی تبدیلی پسند آئی، اس میں اپنائیت تھی۔ پری کی سوچ پہ شاید کوئی بیل چڑھنا شروع ہوگئی تھی۔

میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے بولنے کو کہا۔

”آپ کی غیر حاضری میں میری دادی فوت ہوگئیں۔“ مجھے واقعی دکھ ہوا۔ پری اپنی دادی کے بہت قریب تھی۔ شاید میرے جذبات چہرے سے عیاں ہوگئے تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پہاڑ میرے گرد تھے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔

پری نے خود پہ قابو پانے کے بعد اِدھر اُدھر کی غیر اہم باتیں شروع کردیں۔ ان باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ اس کے لہجے میں مٹھاس اور آواز میں کھنک تھی۔ اس کی گفتگو میں بے ساختگی تھی۔ میں اس انداز کے بہاؤ میں غوطہ زن رہا۔ مجھے وقت کے گذرنے کا علم ہی نہ ہوا۔

میں نے یک جہتی کے عمل کو مزید دلچسپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

”چلو کہیں لنچ کرتے ہیں۔“ میں نے پری کو سوچنے کا موقع نہ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ انٹرکام پر شفقت کو بورڈ میٹنگ شام چار بجے رکھنے کے لیے کہا اور باہر نکل گیا۔ پری میرے پیچھے پیچھے تھی۔

VIII

ایوانِ صنعت وتجارت ضلع بھر کے کاروباری مفادات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عموماً اِن کے دو گروپ ہوتے ہیں جو مختلف عہدوں کے لیے الیکشن میں مدِ مقابل ہوتے ہیں۔ فرزندِ قربان نے صدارت کے لیے اچانک میرا نام تجویز کر دیا۔ دوسری طرف سے ہم دونوں کا ایک قریبی تعلق دار مقابلے میں آ گیا۔ میں نے فرزندِ قربان کو بتایا کہ لطف بلا مقابلہ منتخب ہونے میں ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے مخالف کو یقین دلایا کہ اگلے سال ہمارا گروپ اُسے بلا مقابلہ صدر بنا دے گا بشرطیکہ وہ اس سال ہمارے مقابلے میں نہ آئے۔ فرزندِ قربان اس مفاہمت کے مخالف تھا۔ اُس کا موقف تھا کہ ہم اگر اپنا وعدہ نبھا نہ سکے تو سبکی ہوگی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ یہی ہمارے مفاد میں ہوگا۔ وہ بادلِ نخواستہ رضا مند ہو گیا۔

میں ایوانِ صنعت وتجارت کا صدر بن گیا۔

پری اور میں ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے۔ پہاڑوں سے واپسی پر ریستوراں میں دوپہر کا کھانا اس قرب کا آغاز تھا۔ جب مینو کارڈ سامنے آیا تو وہ ایک آدھ پاکستانی ڈش کے علاوہ کچھ آرڈر نہ کر سکی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی لطافتیں اُس پہ آہستہ آہستہ وا کروں گا۔ اُس دن میں نے دو کانٹی نینٹل ڈشیں آرڈر کیں۔ پری نے دفتری قسم کی گفتگو اُس دوران میں بھی جاری رکھی۔ وہ میری ایک مہینے بھر کی مصروفیات جاننا چاہتی تھی۔ میں نے جواب میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کا انداز دیکھتا رہا۔ میں باتوں کے علاوہ اُس کے خوردونوش کے شوق سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

پری نے بتایا کہ دادی کی موت کے بعد اُس کا باپ خاصا پریشان رہتا ہے۔ وہ ذاتی معاملات پر تبادلہ خیال غیر اہم سمجھتی تھی۔ مجھے اس اعتراف کے پسِ پردہ کچھ اور نظر آیا۔

’’کیا وہ کوئی ملازمت کرنا چاہیں گے۔‘‘ میں نے سرسری سا سوال کیا۔

’’آپ کے ہاں نہیں۔‘‘ اُس نے تیزی سے کہا۔

’’میں ایک آدھ دن میں بندوبست کر دوں گا۔‘‘ پری نے نظریں جھکا لیں۔

فرزندِ قربان میرا اہم راز تو ہے لیکن کاروباری معاملات میں اُس کا رویہ غیر لچک دار ہوتا ہے۔ میں نے جب پری کے باپ کو ملازمت دینے کے لیے کہا تو اُس کا ردِ عمل وہی تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ اُس نے اپنے خسارے اور اخراجات پر ایک لمبی تقریر کی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جب اُس کا جوش کچھ کم ہوا تو میں نے اُسے سمجھایا کہ کچھ مسائل کا حل ہتھیار ڈالنے میں ہوتا ہے۔ فرزندِ قربان نے تقریباً اُلجھتے ہوئے جواب دیا۔

"Ok!, Ok! You are impossible"

اگلے دن میں نے پری کو مطلع کیا۔ اُس کی آنکھوں میں کئی رنگ بکھر گئے۔ اظہارِ تشکر کے لیے یہ سمٹتی قوسِ قزح میرے لیے معمہ بن گئی تھی۔ میں اُسے کچھ نہ کچھ دیتے رہنا چاہتا تھا۔

ہمارا تعلق گہرا ہوتا گیا۔ ہم روزانہ تین چار گھنٹے اکٹھے گزارتے۔ ہمارا رشتہ عجیب نوعیت کا تھا۔ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے باتیں کرتے۔ گفتگو بھی ایسی کہ جس کا کوئی موقع نہ ہوتا۔ وہ اکثر اپنی دوستوں کی باتیں سناتی۔ مجھے اُن احمقانہ قصوں سے کوئی غرض نہیں تھی، پھر بھی میں چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اُسے کہانی سنانے کا طریقہ آتا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی بات کو بھی ایسی تفصیل سے سناتی کہ لگتا واقعہ میرے سامنے رونما ہوا ہے۔ ابرار کا براہِ راست ذکر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھار پری اُسے ’’اُنہوں نے‘‘ کہہ کر بیچ میں لے آتی۔ میں خاموش رہنے میں دانائی سمجھتا۔

ایوانِ صنعت وتجارت کا صدر ہونے کی وجہ سے مجھے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا، بعض

اوقات رات بھی باہر بسر کرنا ہوتی۔ ایسے تمام موقعوں پر پری میرے ساتھ ہوتی۔ شب بسری کے لیئے ہوٹل کا ایک کمرہ ہمارے لیے مخصوص ہوتا۔ پہلی دفعہ وہ اکٹھے رہنے میں تذبذب کا شکار ہوئی تھی۔ میں نے اُس کے ساتھ اپنے تعلق پر ایک طویل لیکچر دیا۔ حقیقتاً مجھے اُس کے ساتھ شدید محبت تھی۔ یہ عجیب قسم کا افلاطونی عشق تھا۔ پری کی میرے ساتھ موجودگی ہی انتہائے لطف تھی۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں مسہری پہ سوتی اور میں صوفے پر۔ بعض اوقات میں ساری رات اُسے سوتے میں دیکھتا رہتا۔ وہ ہلکا سا منہ کھول کے اس طرح سوتی کہ اُوپر والے دو دانت ہونٹ پہ ہوتے۔ خواب میں وہ اکثر سرگوشی کرتی۔ میں نے کئی دفعہ سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ غسل خانہ مجھ سے پہلے استعمال کرتی تھی۔ لباس وہیں تبدیل ہوتا۔ میں اُس کے جسم سے اُٹھنے والی خوشبو تک سے واقف ہو چکا تھا۔

اتنے قرب کے باوجود پری نے اپنے اِرد گرد تعمیر کی ہوئی باڑ پہلے دن کی طرح مضبوط رکھی۔ میں کئی دفعہ کمزور اینٹ نکالنے کی کوشش کرتا، کیا مجال کہ اُس نے کبھی ایسا ہونے دیا ہو۔ وہ فوراً جارحیت پر اُتر آتی۔ اُس میں عجیب قسم کی اُنا پرستی تھی۔ بعض اوقات باتوں کو صحیح تناظر کے بجائے ایسے زاویے سے دیکھتی کہ صورت حال مضحکہ نظر آتی، اُس پر ستم یہ کہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں ذرہ بھر لچک نہ دکھاتی۔ اتنے غیر لچک دار رویے پر کچھ نہ کچھ تو ٹوٹنا ہی ہوتا ہے، کیا پری تعلق کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی چھوڑ دے گی! مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ بہتر موقع میسر آنے کی صورت میں ایسا بھی کرسکتی ہے۔

ایوانِ صنعت وتجارت کی صدارت کے دوران میں مجھے صدرِ پاکستان سے دو مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اُسی شہر کے رہنے والے تھے۔ اُن کا خاندان معاشی طور پر اتنا مستحکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ معمولی نوعیت کا کاروبار اُن لوگوں کی بسر اوقات کا سہارا تھا۔ صدر صاحب ایک اوسط درجے کے طالب علم تھے۔ وہ شاید دور ہی ایسا تھا۔ اکثریت اسی درجے کے لوگوں کی تھی جو ملک میں اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کر سکے، شاید اسی وجہ سے ہمارے مسائل حل نہ ہوئے۔ اُنہیں حل کرنے والوں کے ذہنوں کی پیچیدگیاں ان مسائل کا حصہ بن گئیں۔ انہوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے

کام شروع کر دیا۔ ملک کو معرضِ وجود میں آئے ابھی چند برس ہوئے تھے۔ لوگوں کے پاس بے شمار حل طلب مسائل تھے۔ اُن کی برادری میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی تھی۔ انہیں اپنے لوگوں نے بطور قائد قبول کرلیا۔ وہ لوگوں کے کام کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندان کو معاشی طور پر مستحکم بھی کرتے رہے۔ اس طرح سیاسی حلقوں میں بھی ان کا اپنا ایک مقام بن گیا۔ اُنہیں دنوں انھیں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے کی پیش کش ہوئی۔ وہ تمام معاملات کو جوں کا توں چھوڑ کر حکومتی اہل کار بن گے۔ وہ زیادہ ذہین تو نہیں تھے لیکن بے پناہ محنت اور بلا کی موقع پرستی اُن کے مزاج کا حصہ تھی۔ وہ بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے چلے گئے۔ ہر سیاسی اور فوجی حاکم نے انہیں نہ صرف قبول کیا بلکہ نوازا بھی۔ عموماً ان لوگوں کو ایسے آلۂ کار شخص کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو فالتو پرزے کی طرح ہو کہ جہاں چاہا فٹ کر دیا۔ ایک دن وہ باعزت طریقے سے ریٹائر ہو گئے۔

اپنے شہر سے جانے کے بعد وہ واپس نہیں آئے۔ اُن کا آبائی گھر اور محلّہ اُسی طرح رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ لاہور میں مستقل قیام پذیر ہو گئے۔ ہمارے ہاں کی حکومتیں کبھی معیاد پوری نہیں کر سکیں۔ اور ہمارے فوجی حکمران بھی اپنے طے شدہ منصوبوں کے مطابق حکومت سے کبھی علیحدہ نہیں ہوئے۔ ایک آمر کو دوسرے نے چلتا کیا جو ایسے بین الاقوامی گرداب میں گھرا کہ ملک کے ایک حصے کو علیٰحدہ خود مختار دیس بنوا گیا۔ اُسے نظر بند کر دیا گیا اور اس دوران میں اُس کی موت واقع ہو گئی۔ پہلی جمہوری حکومت فوج کے قبضے میں آئی اور آمر خود ہوائی حادثے کی نذر ہو گیا۔ بعد کی حکومتوں کو ملک کے صدور برطرف کرتے رہے۔ ایک وزیر اعظم دوسری بار بھاری اکثریت کے ساتھ آئے۔ وہ نظام سے مقابلہ کرنا سیکھ گئے تھے۔ چنانچہ اُس وقت کے صدرِ پاکستان کو استعفٰی دینا پڑا۔ اس دفعہ وزیر اعظم کو صدر کے بجائے کرپشن کے الزامات کا سامنا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ وزیر اعظم کے لیے اپنے عہدے کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی اور اس صلے میں انہیں صدر مملکت بنا دیا گیا۔

پہلی دفعہ انہیں ایوانِ صنعت وتجارت نے کوئی سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مدعو کیا۔ انہیں بہترین کارکردگی پر صنعت کاروں کو انعامات بھی دینا تھے۔ تقریب انعامات میں، میں نے صدر کو

خوش آمدید کہا۔ ان کی توجہ شہر کی ابتر حالت کی طرف مبذول کرائی اور تمام حاضرین سے درخواست کی کہ وہ اتنے اہم صنعتی شہر کی یاد میں دو منٹ خاموش کھڑے ہو جائیں۔ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سب سے پہلے صدر صاحب اُٹھے۔ ان کی تقلید میں تمام حاضرین بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ صدر نے اپنے خطاب میں میری تعریف کے پل باندھ دیے۔ اُس دوپہر کے کھانے پر میں نے صدر سے پری کا تعارف بھی کرایا۔ اتنے مشہور اور نامور لوگوں کے درمیان خود کو پا کر وہ پھولے نہیں سما رہی تھی۔ صدر کے ساتھ اُس نے تصویریں بھی بنوائیں اور صدر نے پری کے ساتھ چند باتیں بھی کیں۔

صدر کے ساتھ یہ ملاقات بہت سے واقعات کا پیش خیمہ تھی۔

ایوان کے دفاتر کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر صدر سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اُس تقریب میں بھی میں پری کو ساتھ لے کر گیا تھا۔ صدر نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ کبھی کبھار ہم دونوں کو ایوانِ صدارت میں کسی نجی دعوت پر بلا لیتے۔ میں ان دعوتوں سے قطعاً لطف اندوز نہیں ہوتا تھا۔ مجھے وہاں لوگوں کے تعقل پر حیرت ہوتی۔ وہاں کچھ بادشاہ اور کچھ بادشاہ گر قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ اُن میں بعض کے ساتھ میرے تعلقات کافی حد تک ذاتی نوعیت کے ہو گئے تھے۔ ہمیں وہ اپنے ہاں مدعو کرتے۔ میں بھی اُن کے لیے لاہور یا اسلام آباد میں دعوتوں کا اہتمام کرتا۔ ان ملاقاتوں نے میرا دائرہ تعلق کافی وسیع کر دیا تھا۔ میری شناخت فنانس اور انڈسٹری کے علاوہ اب سیاست کے حوالے سے بھی ہونا شروع ہو گئی۔

مجھے صدر کے ہاں مدعوئین کے تعقل پہ حیرت ہوتی۔ اکثریت کی گفتگو میں اعلیٰ سطح کے لوگوں والی ذہانت کا فقدان تھا۔ ان کے موضوع نہایت ذاتی نوعیت کے ہوتے۔ وہ اپنی تعریفیں کرتے یا غیر حاضر لوگوں کی غیبت میں مصروف ہوتے۔ اُن کے قہقہے بلند اور کھوکھلے تھے۔ وہاں سب سے بھونڈی حرکت لطیفے بازی تھی جس کا دور کھانے کے بعد شروع ہوتا۔ گھسے پٹے بازاری لطیفے دہرائے جاتے۔ ہر بار ردِ عمل بھی ایک سا ہوتا۔ پرانے وقتوں کے سکھوں کے لطیفوں کا علیٰحدہ دور ہوتا۔ سکھوں کی نئی نسل کے لطیفے سامنے نہیں آ رہے ورنہ وہ بھی سنائے جاتے۔ ان دعوتوں میں

میرے لیے کوئی کشش نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ ایوانِ صدر میں منعقد ہوتی تھیں۔ وہاں جانے سے کئی ایک مقاصد حل ہو رہے تھے۔ پری کے لیے یہ دعوتیں بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ وہ نت نئے لباس سلواتی۔ ہر دعوت میں بالوں کے نئے سٹائل کا اہتمام کرتی۔ میرے خیال میں جو زندگی وہ گزار رہی تھی اُس کا عکس اُس کے ہاتھ کی لکیروں میں بھی نہیں تھا۔ ملک کی اعلیٰ ترین سطح کے لوگوں کے ساتھ اُس کا ملنا جلنا تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنی ذات اور اپنے مفاد کو ترجیح دی تھی۔ ایوانِ صدر کی بے رنگ دعوتوں میں جانا بھی اسی وجہ سے تھا۔ اپنی تمام تر خود غرضی کے باوجود پری کے معاملے میں، میں قطعاً ایسا نہیں تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے اندر ایک ایسا جذبہ اُبلنا شروع ہو جاتا جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔ بعض اوقات میں اُسے اپنے ساتھ لگا کر محسوس کرنا چاہتا، اُس کے جسم کے خطوط کی حدیں جاننے کو مچل جاتا، لیکن پھر کہیں سے اُس کے چہرے پر وہ پاکیزگی نظر آ جاتی جس کے آگے میں بے بس تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آ جاتی اور آنکھوں میں اتنا سکون ہوتا کہ وہ طمانیت وہاں سے نکل کر میرے اندر سما جاتی۔

انہیں دعوتوں میں ایک دفعہ وزیرِ اعظم سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے پری میں کافی دلچسپی لی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہر جوان، خوبصورت عورت کو اسی شوق سے ملتے ہیں۔ ہماری یہ ملاقات ایوانِ صدر کے سبزہ زار میں ہوئی تھی۔ وہ مہمانوں سے باری باری ملے۔ اُن دنوں دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان سربراہی ملاقات متوقع تھی۔ ہمارے وزیرِ اعظم نے اپنے پڑوسی ہم منصب کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی جسے اُصولی طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ صرف تاریخیں اور سفارتی تفصیلات طے ہونا باقی تھیں۔ خیال تھا کہ وزیرِ اعظم اس نئی صورتِ حال پر غیر رسمی بات چیت کریں گے۔ وہ کافی دیر تک خواتین کے ساتھ موسم اور آموں کی قسموں پر محوِ کلام رہے۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے ہم لوگوں کے پاس آئے۔

''صدر صاحب! بھوک سے کڑّل پڑ رہے ہیں، پیٹ پوجا کرائیں۔''

صدر نے ایک اے۔ ڈی۔ سی کو اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا اعلان ہو گیا۔ وزیرِ اعظم کھانے کی میز پر مختلف ڈشوں کے متعلق بات چیت کرتے رہے۔ انہیں یہ ڈشیں نہ صرف

کھانے میں پسند تھیں بلکہ ان کے بقول وہ خود انہیں پیشہ ور باروچیوں کی بہ نسبت بہتر طور پر پکا سکتے تھے۔ کھانے کے دوران میں ایسی ہی گفتگو چلتی رہی۔ اختتام پر سبز چائے اور کافی کا موازنہ ہوا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ کے وہ حاضرین کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اس مختصر سی ملاقات نے مجھے بہت مایوس کیا۔ اُس رات صدر کے مہمانوں کی فہرست میں وزیرِاعظم بھی تعقل کے کم کم ہونے کا واضح ثبوت تھے۔ انہوں نے کسی قومی یا بین الاقوامی مسئلے کا ذکر تک نہ کیا۔ انسان ہمیشہ ایسی گفتگو کرنا پسند کرتا ہے جس کے بارے میں وہ تفصیلات جانتا ہو۔ ایسا ملک جو بے پناہ مسائل کا شکار ہو، کیا واقعی اُس کے وزیرِ اعظم کو اچھا باروچی ہی ہونا چاہئے۔ اُس رات میرے اس نظریے کو کہ ملک اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والوں کے رحم وکرم پر ہے، مزید تقویت ملی! وزیرِ اعظم نے مجھے یاد رکھا۔

چند دن بعد ایک دعوت نامہ اور آنے جانے کا ہوائی ٹکٹ موصول ہوا۔ وزیرِ اعظم مختلف طباقات کے لوگوں سے پڑوسی وزیرِ اعظم سے ملاقات کے طریق کار اور دیگر تفصیلات پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ ملک کے چیدہ چیدہ صنعت کاروں اور کاروباری حضرات کے ساتھ مجھے بھی بلایا گیا۔ اس دعوت نامے نے میرے وقار میں مزید اضافہ کیا۔ پری میرے ساتھ تھی، کافی تگ ودو کے بعد میں اُسے کانفرنس ہال میں لے جا سکا۔ دیواروں پر سابقہ سربراہانِ حکومت کے پورٹریٹ آویزاں تھے۔ مختلف سمتوں میں گھورتے سابق سربراہان اور میز کے گرد موجود ایلیٹ ذہن پہ دبدبہ ڈالنے کے لیے کافی تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وزیرِ اعظم تشریف لائے۔ تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ چند وزرا بادلِ نخواستہ اُٹھے بڑھتے وزیرِ اعظم نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پری پر اُن کی نظر پڑی تو وہ مسکرائے۔ پری نے احتراماً سر جھکا کے اظہارِ تشکر کیا۔ وزیرِ اعظم نے پھر بغیر مسکرائے میری طرف دیکھا۔

”آپ کے خیالات یقیناً ہمیں کوئی فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے۔“

میں نے محسوس کیا کہ اُن کی آنکھیں گدلا گئی تھیں۔ شروع میں غالباً وہی پاکیزگی لہرائی جو میرے اندر آباد ہے۔ لیکن بعد میں شاید ان کی طاقت کا احساس غلبہ پا گیا ہو۔ یہ میرا وہم بھی ہو

سکتا ہے۔ اُن دنوں ہر آدمی مجھے ابرار نظر آتا۔

”میاں صاحب! مہمانوں کو کھانے پینے کو بھی کچھ دیا ہے؟“۔ انہوں نے ایک طرف دیکھتے ہوئے کسی اور سے خطاب کیا۔

”جناب! پیٹ پوجا کرا دی گئی ہے۔“ مجھے صدر صاحب کی دعوت یاد آ گئی۔

”ہاتھ ہلکا رکھنا تھا...... آج مہمان نوازی کا مجھے بھی شرف حاصل ہونا ہے۔“ میں نے اپنا دایاں گال سہلایا۔

وزیرِاعظم سامنے میز پر کہنیوں تک بازو رکھے بیٹھے تھے۔ اسی انداز میں بیٹھے اُنھوں نے بغیر بازو ہلائے یا آنکھیں جھپکے بولنا شروع کر دیا۔ موٹر وے ایکسٹینشن پر دیر تک گفتگو جاری رہی۔ ایک کرکٹ میچ کا واقعہ سنایا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ موصوف جب بھی آؤٹ ہوئے اَمپائر نے وہ مخصوص گیند ”نو بال“ قرار دے دی تھی۔ بات چیت کا رخ پھر اندرونِ لاہور کے غیر معروف کھانے پینے کی دکانوں کی طرف مڑ گیا۔ وہاں سے پڑوسی وزیرِ اعظم کے کھانے کا مینو زیر بحث آیا۔ وزیرِاعظم ایسا مینو تیار کرنا چاہتے تھے جس میں پاکستانیت کے ساتھ لاہوریت پائی جاتی ہو۔ اُن کے رفقا میں سے کسی نے فقرہ کسا کہ پڑوسی وزیرِاعظم تو بمشکل چند نوالے کھانا ہی کھاتا ہوگا کہیں سارا اہتمام دھرے کا دھرا نہ رہ جائے! ایک طرف سے آواز آئی کہ وہ تو چند نوالے ہی کھائے گا، دیگیں تو ہمیں صاف کریں گے! اسی طرح ایک اہم موضوع پر بلایا گیا اجلاس غیر اہم گفتگو کی نذر ہی ہو گیا۔ دو گھنٹے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ غالباً وزیرِاعظم کے پاس دوپہر کے کھانے سے پہلے دو گھنٹے فالتو تھے۔ ملاقات کے اختتام سے پندرہ منٹ پہلے وزیرِاعظم نے اچانک پینترہ بدلا۔

”ہمارا پڑوسی اور ہم ایک دوسرے کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری حکومت اب اس محاذ آرائی کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ میں چاہوں گا کہ ہم اچھے پڑوسیوں کی طرح رہیں۔“ وزیرِ اعظم رکے...... اس سین کی غالباً ریہرسل کی گئی تھی۔

”قوم آپ کے حکم کی منتظر ہے...... جنگ ہو یا صلح!! میں اِن سب چنیدہ مہمانوں کی طرف سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کی آپ کا ہر فیصلہ تاریخ ساز ہوگا۔“ ایک وزیر نے انتخابی مہم والے لہجے

میں کہا۔

’’میں اپنی قوم کا خادم ہوں۔‘‘ وزیر اعظم اسی طرح بغیر جنبش کیے بیٹھے تھے۔

’’میرا ہر فیصلہ قومی مفاد میں ہوگا۔ میں چاہوں گا کہ اپنے پڑوسی کو خلوصِ نیت کے ساتھ پسندیدہ ترین قوم کا رتبہ دیا جائے!۔‘‘ وزیر اعظم نے سر پر کھجلی کی۔ سب چہروں پر حیرت، سکتیا ور تائید کے ملے جلے تاثرات دیکھنے کو ملے۔ میرا اپنا ردِ عمل واضح نہیں تھا۔ مجوزہ رتبے سے پڑوسی ملک کے ساتھ درآمد برآمد شروع ہو جانا تھی۔ میری ایک فیکٹری کا تیار مال وہاں برآمد ہو سکتا تھا۔ جب کہ دوسرے کارخانے کے لیے اُدھر سے خام مواد کی درآمد کی ضرورت تھی۔ اسی طرح چند دوسری اشیا کا تبادلہ ممکن تھا۔ صنعت کار کا مفاد اُس کا سرمایہ ہوتا ہے۔ وہ جغرافیائی یا نظریاتی سرحدوں کا اتنا قائل نہیں ہوتا۔ اُس کی سرحدیں اپنے مفادات کے خطے تک محدود رہتی ہیں۔ وزیر اعظم بھی شاید انفرادی مفادات ہی کو نئے خطوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔

وزیر اعظم کے الفاظ تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ اُن سے انکار ممکن نہیں تھا۔ پری نے کرسی پر جگہ بدل کر گلا صاف کیا تو میں بھی اُس طرف متوجہ ہوا۔

’’جناب وزیر اعظم۔‘‘ اُس کی آواز میں زیادہ دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کی گھٹن موجود تھی۔ وزیر اعظم اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے دونوں بازو پھر میز پر رکھ لیے۔

’’یہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے۔‘‘ لہجہ اب خود اعتمادی لیے ہوئے تھا۔ ’’اتنا بڑا کہ اس کے لیے شاید ریفرنڈم کی ضرورت پڑے۔ ایک فقرہ حرفِ آخر نہیں ہے۔ اہم ترین ادارے کا مفاد معاشرے کے ہر ستون کے ساتھ وابستہ ہے۔ جہاں میں کام کرتی ہوں۔‘‘ اُس نے میری طرف دیکھا۔ ہماری نظریں ملیں مگر میں نے تمام پیغامات کی ترسیل روک لی۔

’’وہاں ایک فیکٹری میں بیڈ شیٹس بنتی ہیں اور وہ وہاں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔‘‘ بیڈ شیٹس کے ذکر پر، وزیر صاحب جنہوں نے ابھی ابھی تقریر کی تھی، دل کھول کر ہنسے۔

’’دونوں ہمسایہ ممالک کے تعلقات کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ دوسرے، میری ناقص رائے میں۔‘‘ یہاں وہ نظریں جھکا گئی۔ میں کسی تلخ فقرے کی توقع کر رہا تھا۔ ’’ہم ایک بڑے دریا میں رہ رہے ہیں۔ یہاں ہر حجم کے مگرمچھ ہیں۔ بڑا مگرمچھ چھوٹے کو نگل جاتا ہے۔ کیا

ہم صنعتی طور پر اپنی حفاظت کرنے کے اہل ہو گئے ہیں؟‘‘

اس کے ساتھ ہی ملاقات گاہ میں لہجوں کی پٹاری کھل گئی۔

کھانے کے دوران میں ماحول کشیدہ رہا۔ آج وزیر اعظم نے مختلف ڈشوں اور اُن کے اجزائے ترکیبی پر اظہارِ رائے نہیں کیا۔ اُن کی الجھن بار بار سر کھجانے سے عیاں تھی۔ وہاں موجود لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ چند وزرا حاضرین کو قائل کرنے میں مصروف تھے۔ پری نے ایک قومی مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی کارکردگی سے مطمئن اور مسرور نظر آ رہی تھی۔ اس تمام دورانیے میں، میں نے اُس سے ارادتاً بات نہیں کی۔ میں اُس کے قریب تو نہیں گیا لیکن دور بھی تھا۔ اُس کی ہر حرکت میری نظر میں تھی۔ وزیر اعظم نے اُسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور دونوں کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ پری نے میری طرف دیکھا اور پھر دونوں میرے پاس آ گئے۔ وزیر اعظم مجھے بازو سے تھام کر ایک طرف لے گئے۔

’’معظم صاحب!۔‘‘

’’جی! مسٹر پرائم منسٹر۔‘‘ میں نے مودبانہ کہا۔

’’میں نے کل صبح دس بجے مِس زہرہ جبیں کو اپنے دفتر آنے کی دعوت دی ہے مگر انہوں نے آپ کے بغیر آنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ میں چاہوں گا کہ آپ بھی تشریف لائیں۔‘‘

’’بہتر مِسٹر پرائم منسٹر۔‘‘ وزیر اعظم بظاہر مطمئن نظر آئے۔۔

’’آپ نے ہڑیسہ چکھا......؟‘‘ وہ اپنے پسندیدہ موضوع پر گفتگو میں مشغول ہو گئے یعنی تعقل کے نچلے خط والا نظریہ......

اُس رات پری بہت پریشان تھی۔

’’تم نے ایک اہم قومی مسئلے کی طرف اشارہ کر کے حکومت کی بنیاد ہلا دی ہے۔‘‘ میں نے اُسے حوصلہ دیا۔ یہ تھی بھی حقیقت۔ پری کا ذکر کیے بغیر شام کے اخباروں نے تہلکہ مچا دیا تھا۔

’’بات کچھ اور ہے۔ وزیر اعظم وہ نہیں ہے جو آپ کو نظر آیا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ اور تھا۔‘‘ پری نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

’’تمہاری تشریح ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔‘‘

’’نہیں! عورت آنکھوں کی زبان سمجھتی ہے۔ آج کے بعد میں اپنے دفتر کے علاوہ کہیں

نہیں جاؤں گی۔''

''کل دس بجے کی ملاقات تو طے ہے اور اُس کے بعد......'' میں نے اُسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ مسہری پہ گرتے ہی سو گئی۔ اس رات خواب میں اُس نے معمول سے زیادہ باتیں کیں۔

اگلی صبح پورے دس بجے ہم وزیرِ اعظم کے دفتر میں تھے۔ وہ تازہ دم اور خوش نظر آئے۔

''آپ نے ایک اہم مسئلے پر ہماری رہنمائی کی ہے۔ میں اور میرے رفقا آپ کے ممنون ہیں۔ پڑوسی وزیرِ اعظم کے دورے کی تاریخ کل رات کو طے ہو گئی۔ میں آپ کو اپنی مشیر مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا رتبہ سینئر وزیر کے برابر ہو گا۔'' یہ حیران کن پیش کش تھی۔ پری نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ میں اُس کے پُرسکون چہرے اور اعتماد پر حیران تھا۔

''حلف برداری کی تقریب کا اہتمام ہو چکا ہے۔ تمام کاروائی ایک گھنٹے کے اندر مکمل ہو جائے گی۔'' میں نے کرسی میں جگہ بدلی۔

''میں آپ کے اعتماد کی قدر کرتی ہوں۔ حالات شاید میری سوچ سے تیز قدم ہیں۔ مجھے چند گھنٹے سوچنے کا موقع دیں۔'' پری نے بغیر جھجک کے جواب دیا۔

''میرا اسکریٹیریٹ آپ سے رابطہ رکھے گا۔'' وزیرِ اعظم کے آخری الفاظ تھے۔

''نکلیں یہاں سے۔ میرا اس شہر میں دم گھٹ رہا ہے۔'' پری نے چیختے ہوئے کہا۔ اُس نے ایسی پیشکش ٹھکرا دی جو مزاجاً اُسے قبول کر لینا چاہئے تھی۔

''اُس نے مجھے دو محاذوں پر شکست دینا تھی۔ مشیر مقرر کر کے میرے نظریات کو مجھی سے جھٹلوانا...... اور...... ہمارے درمیان خود آنا۔'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ مجھے کار کی رفتار، سیاہ سڑک اور پیچھے کی سمت بھاگتے درخت ایک خواب لگے۔ میں نے پری کو جیت لیا تھا۔ اُس کا اعتراف میرے کئی سالوں کی تپسیا کا نتیجہ تھا۔ میں اُسے بازوؤں میں لینا چاہتا تھا۔ اُس کے ماتھے پر اپنی محبت کی مہر ثبت کرنے کی خواہش تھی۔ لیکن ایسا کر کے میں نے پری کو عام عورت بنا دینا تھا۔ وہ یقیناً عام عورت نہیں تھی۔

IX

وزیرِ اعظم نے ہم دونوں کو مہمان وزیرِ اعظم کی آمد پر تمام تقریبات میں شمولیت کی دعوت دی، ہم نے اس دعوت نامے پر تفصیلی گفتگو کی۔ میں شمولیت اختیار کرنا چاہتا تھا، لیکن پری بضد تھی کہ بہت سی وجوہات کی بنا پر ہماری وہاں موجودگی مناسب نہیں ہو گی۔ یہ اُس کا آخری فیصلہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کے ارادے کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ باہمی طور پر طے ہوا کہ ہم ان تقریبات میں شامل نہیں ہوں گے تاہم اُس دن ہم لاہور میں ہوں گے۔ لاہور میں موجودگی میری ہٹ دھرمی تھی صرف اس مفروضے پر کہ شاید پری اپنے رویے میں کوئی تبدیلی لے آئے۔!

مہمان وزیرِ اعظم کی آمد پر عوامی ردِعمل کی حکومت کو توقع نہیں تھی۔ اُس رات لاہور منقسم تھا۔ ایک طرف سرکاری تقریبات کو رنگوں سے منور کیا گیا تھا۔ تمام بڑی سڑکیں بینروں اور پوسٹروں سے سجی ہوئی تھیں۔ پولیس نے تمام چوک قبضے میں لے رکھے تھے۔ چھوٹی اور اطراف کی سڑکوں سے لوگ شاہراہوں پر چڑھ دوڑنا چاہتے تھے۔ پولیس انہیں روکے ہوئے تھی۔ لاٹھی چارج، آنسو گیس اور گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ ملک ٹوٹنے کے بعد اُس رات قومی نظریہ کو خطرہ لاحق تھا۔ ہنگامہ کرنے والوں کو مسلح افواج کے سربراہوں کے رویے سے بھی تقویت ملی۔ تینوں سربراہ لاہور میں موجود تھے۔ اُنہوں نے تقریبات میں شرکت سے معذرت کر دی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال پہ گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔

شہر سنسان تھا سوائے اُن چند جگہوں کے جہاں پولیس اور ہجوم ٹکرا رہے تھے۔ ہم مال سے

جیل روڈ پر جانا چاہتے تھے۔ بند شیشوں میں بھی کار کے اندر گولیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے شیشہ نیچے کیا۔ فضا میں بارود کی بو تھی۔ چوک پر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی جب کہ دوسری طرف مشتعل ہجوم! دونوں گروہ نظریوں کی حفاظت میں مصروف تھے۔ میں نے ایک سپاہی کو اشارے سے بلایا۔

‘‘انہیں کیوں روک رہے ہو۔’’ میں نے چوک کے دوسری طرف اشارہ کیا۔

‘‘سر! یہ بہت ضروری ہے۔’’ اُس نے اہمیت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے جواب دیا۔

‘‘کیوں؟’’

‘‘سر! گلی کوچوں میں ان کی اتنی تعداد ہے کہ یہ اُن کا تکہ بوٹی کر دیں۔’’ اُس کا اشارہ غیر ملکی وفد کی طرف تھا۔

‘‘تو کیا یہ درست نہیں ہوگا؟’’ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

‘‘دشمنی الگ، وہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی حفاظت ہمارا اخلاقی فرض ہے۔’’ اُس کے لہجے میں اپنی اقدار کا خلوص تھا۔

‘‘یہ تمہیں افسران نے بتایا ہے۔ تمہاری ذاتی رائے کیا ہے’’

‘‘میں سرکاری ملازم ہوں...... میرا مشورہ ہے آپ گھر واپس چلے جائیں۔’’

میں واپس ہوٹل آ گیا۔ کار پارک میں کیکٹس کی جھاڑی کے پیچھے مجھے حرکت نظر آئی۔ میں نے اُسے نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا لیکن پری نے وہاں جانے کو کہا۔ جھاڑی کے پیچھے ایک زخمی نوجوان چھپا ہوا تھا۔

‘‘آپ کو زخم کیسے آیا؟’’ نوجوان تعلیم یافتہ نظر آ رہا تھا۔

‘‘آپ لوگ بچ گئے ہیں۔’’ وہ جوش میں بولا۔ ‘‘غداروں نے دو منزلیں اُن کے لیے مخصوص کی ہوئیں ہیں۔ ہمارا حملہ ناکام ہوگیا۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔’’

‘‘میری ابھی ایک پولیس والے سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ وہ مہمانوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔’’

‘‘قوم اُنہیں دشمن سمجھتی ہے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔’’

‘‘میرے خیال میں سیاست دانوں نے آپ کو گمراہ کیا ہوا ہے۔ اُن کے پیشِ نظر ملک کے بجائے ذاتی مفاد ہے۔’’

‘‘مجھے پہلے سمجھ جانا چاہتے تھا۔’’ اُس نے میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔ میں اس جملے کے لیے تیار تھا۔ دونوں ہاتھوں سے میں نے اُسے جھاڑی کی طرف دھکیل دیا۔

ہم کمرے میں آ گئے۔

لاہور کی اپنی ایک زبان ہے۔ اس لہجے کو ترتیب پاتے صدیاں لگیں۔ یہ کئی سیاسی مناظر کا گواہ ہے۔ اس میں خوبصورت دوشیزہ کی معصومیت ہے تو بدمست ہاتھی کا دیوانہ پن بھی۔ اُس رات لاہور بہرا ہو گیا تھا یا اُسے کسی سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ممکن ہے اتنا کچھ دیکھ چکا تھا کہ اب تمام تبدیلیاں اُس کے لیے غیر اہم ہو گئیں تھیں۔ لاہور کے اندر سے کوئی لاوا نہیں پھوٹا۔ پولیس اور ہنگامہ کرنے والے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے اور آخر میں یہ تنازعہ ایک کھیل بن گیا۔

کمرے میں ہم صوفے پہ بیٹھے تھے۔ پری ذہنی کھچاؤ کا شکار تھی اور یہ اُس کی شخصیت کا نیا رخ تھا۔ شاید آج جذبات چھپانے کا دن نہیں تھا۔

‘‘آج بہت اہم دن ہے۔ تاریخ کی اگلی کروٹ کا علم نہیں۔ لوگ شاید اس فیصلے کے لیے تیار نہیں تھے۔’’ پری وفاداری تبدیل کر رہی تھی؟ میں نے ماحول سے سنجیدگی کی چادر اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔

‘‘شماریات تمہارا شوق اور ذریعہ معاش ہے لیکن تاریخ اور سیاست میں تمہاری دلچسپی پر حیران ہوں...... تم دس برس پہلے مجھے کیوں نہیں ملیں؟۔’’

‘‘دس سال پہلے کیا ہوتا؟’’ اُس نے میری طرف دیکھتے تیکھے لہجے میں کہا۔

‘‘وہی...... جو آج ہوا ہے۔’’ میں نے بھولپن سے کہا۔

میرا چہرہ دیکھتے ہی پری پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ قہقہوں کی پھلجڑیاں چھوڑتی رہی۔ ہنستے ہنستے وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں آ گری۔ چیزیں کششِ ثقل سے گرتی ہیں۔ پری

کا اور میرا رشتہ جذباتی طور پر مادی نوعیت کا نہیں تھا۔ پری نے ہنستے ہوئے گود سے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں ابھی تک حیرت اور سکتے پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ ہماری آنکھیں ملیں تو مجھے پری کی آنکھوں میں ایک نیا عکس نظر آیا۔ وہاں جلتے صحراؤں کی آگ تھی۔ اُس نے ہنسنا بند کر دیا۔ اُس آگ کی تپش مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ جلتا ہوا صحرا ہونے کے باوجود میں نے اس آگ کو ضبط کی شبنم سے ٹھنڈا رکھا ہوا تھا۔ اُس رات میں نے ایک عہد توڑ دیا۔ ہم دونوں فانی لوگوں کے زمرے میں آ گئے۔

ہم پجاری و معبود کے بجائے خواہشات کی بستی کے دو مکین بن گئے۔

پہلی دفعہ جب پری اور میں ریسٹورنٹ گئے تو اُسے مینو کارڈ سے کھانے کا مناسب انتخاب کرنے میں دقت پیش آئی تھی۔ اُس بات کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ میں نے اپنے تجربے کی روشنی سے اُس کے ارتقا کی راہیں منور کیں۔ وہ اعتماد سے آگے بڑھتی رہی۔ اُس کی نفسیات میں آگے ہی بڑھنا تھا اور میں اس تشنگی کی تکمیل کا ذریعہ بنا۔ پری پُر اعتماد اور خود سر تو پہلے ہی تھی اب زیرک اور معاملہ فہم بھی ہو گئی۔ میں نے اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھا۔ مجھے اس امر سے تسکین حاصل ہوتی کہ جو قلم میں نے لگائی تھی اب پھولوں اور خوشبو سے لد گئی ہے۔ پری اور میں ایک دوسرے کے قریب تھے لیکن بعض اوقات ہم بہت دور ہو جاتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اُسے مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ اُس نے صرف وہی کرنا ہے جو وہ طے کر چکی ہے۔ ایسے موقعوں پر میری عجیب کیفیت ہو جاتی۔ میرے اندر نفرت کا ناگ پھن پھیلائے کھڑا ہو جاتا اور اُس کی شوکر مجھے اپنی آنکھوں سے نکلتی محسوس ہوتی۔ وہ مخصوص لمحہ مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیتا۔ میں فیصلہ کر لیتا کہ پری کو اُسی حالت پہ پہنچا دوں گا جو اُس کی میرے پاس آنے سے پہلے تھی۔ اس زلزلے سے مجھے صبر اور عقیدت کی تپسیا کا محل گرتے محسوس ہوتا۔ میں نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے بے یقینی کی کھائی کو پار کرتے ہوئے ہر قسم کے ذرائع کا استعمال سیکھا تھا۔ اس طرح کی سوچ میری تربیت کے عین مطابق تھی۔ لیکن پھر میں خوفزدہ ہو جاتا۔ پری کی آنکھیں اور اُس کے جسم سے پھوٹتی لطافتیں مجھے اپنے گھیرے میں لے لیتیں۔ میں نے پری کو تعمیر کیا تھا۔ تغاری میں گارا ڈھو کے ایک ایک اینٹ

اُٹھائی۔ معمار کے لیے اپنی بنائی عمارت کو ڈھانا ناممکن ہوتا ہے۔ پری میری حیثیت کے ساتھ وابستہ بالادستی کو جھٹلانے پر اُتر آتی اور میں آخری حدود پھلانگنے کو تیار ہو جاتا۔ اس شدید اختلاف کی موجودگی میں ہمارا نیا رشتہ اسی طرح قائم تھا۔ میں محسوس کرتا کہ اس تعلق نے ہمارے رشتے کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ پاکیزگی کی شبنم کو جسموں کے بھانبھڑ نے تپتی ریت میں تبدیل کر دیا تھا۔

X

پری کا باپ اچانک انتقال کر گیا۔

پری کا خیال تھا کہ وہ اپنی ماں کے بغیر زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکا۔ مجھے اُس کی وفات کی اطلاع شام کو ملی۔ جنازے میں شامل ہوا اور نہ ہی پری کے گھر تعزیت کے لیے گیا البتہ تجہیز و تکفین کے تمام اخراجات میں نے اُٹھائے۔ پری نے اپنے عزیز و اقارب کو باور کرایا کہ وہ اکیلے زندگی گزارے گی چناں چہ دو دن کے بعد وہ چلے گئے۔ اُن کے طعام کا بندوبست بھی میرا تھا۔

تیسرے دن وہ دفتر آئی۔ میں نے اُس کے شعبے میں جا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مجھے اُس کے باپ کی موت کا صحیح معنوں میں دکھ تھا۔ کچھ دیر ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اُس نے اپنے باپ کی آخری رسوم اور دیگر اخراجات پر میرا شکریہ ادا نہیں کیا، میں اس کی توقع بھی نہیں رکھتا تھا۔ پری کے ساتھ رہنے والے فوت ہو چکے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اُسے میری مدد اور حوصلے کی ضرورت ہے۔

''میں اگلے دو دن کے اندر تمہارا مکان بیچ رہا ہوں، اور اسی عرصے میں ایک چھوٹا لیکن آرام دہ گھر بھی خریدا جائے گا۔ تم آج ہوٹل میں منتقل ہو جاؤ۔ نئے گھر کی قیمت وغیرہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ میں موجود ہوں۔ چند دنوں میں ہر شے صحیح جگہ پر فٹ ہو جائے گی۔''

مجھے پہلی دفعہ اس کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے جنہیں اُس نے چھپانے کی کوشش کی اور نہ ہی میں نے اُسے روکا۔ وہ جی بھر کر روئی اور میں طوفان کو اُترتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ خود کو سنبھال گئی۔

اُس کے ہونٹوں پہ تھکی سی مسکراہٹ تھی۔

اس کی ضرورت نہیں۔'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ضرورت ہے..... مکان کی قیمت تمہارے بنک میں چلی جائے گی۔'' پری کی آنکھوں میں وہی ست رنگی پھلجھڑیاں لہرا گئیں۔

''تم گھر جا کر غیر ضروری چیزوں کو ٹھکانے لگاؤ۔ ہوٹل میں کمرہ مخصوص سمجھو..... میں شام کو ملنے آؤں گا۔''

پری کے لیے مَیں نے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا جو ایک جدید کالونی میں تھا۔ پری نے اُسے سجا کر اپنی موجودگی کو ہر چیز میں منتقل کر دیا۔ وہ ایک ہفتہ ہوٹل میں رہی۔ یہ سات دن ہمارا ہنی مون تھے۔ میرا خیال تھا کہ پری کا گھر ان سات دنوں کی توسیع ہو گا لیکن ایسے نہیں ہوا۔ گھر میں منتقل ہونے کے فوراً بعد اُس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔

''آپ روز نہیں آیا کریں گے۔'' اُس نے پہلے دن معاملات بالکل واضح کر دیئے۔

''ہفتہ میں ایک آدھ بار اور بس۔ سورج غروب ہونے کے بعد آپ ہرگز، ہرگز، نہیں ٹھہریں گے۔ ہمیں محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔''

''کیوں؟۔'' میں ہر زنجیر توڑنے پر تل گیا۔

''اردگرد لوگ رہتے ہیں۔ یہ گھر اور اس میں رہنے والے اُن کی آنکھوں میں کھٹکنے نہیں چاہئیں۔'' اُس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ تمہارا گھر ہے۔ تم جس طرح چاہو رہو۔ تمہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔''

میں نے پہاڑوں کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیا تھا۔ دریاؤں کی طغیانی میرے لہجے کو بہا کے لے گئی۔

''مجھے اپنی اجازت چاہیے اور وہ نہیں ہے۔'' پہاڑوں کا ٹھہراؤ اُس کے لہجے میں منتقل ہو چکا تھا۔

''ہوٹل میں تم نے خود کو اجازت دے رکھی تھی۔''

''آپ اس قابل نہیں کہ آپ سے ملا جائے۔''

اُس نے دروازہ بند کر دیا۔

اگلے دن پری معمول کے مطابق دفتر آئی۔ ایک اہم مسئلے پہ ہماری ملاقات طے تھی۔ اُس نے کاغذات اور خاکوں کی مدد سے تقریباً آدھا گھنٹہ اپنا نقطۂ نظر بیان کیا اور میرے سوالوں کے جواب دے کر چند شکوک رفع کیئے۔ اُس نے ملاقات کے دوران میں کل والے واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ اپنا معاملہ نمٹا کے ایسے گئی جیسے ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہ تھے۔

اُس گھر میں کئی مرتبہ تھوڑی دیر کے لیے گیا لیکن میں نے اپنا ارادہ بنا لیا تھا!

حمیدی

فصل دوئم

حمیدی

I

وہ دو بیڈ روم کا گھر تھا۔ چھوٹے مگر آرام دہ لاؤنج کا دروازہ برآمدے میں کھلتا اور وہاں سے تین سیڑھیاں پورچ میں اُترتی تھیں۔ کار آ کر رُکی اور معظم علی خاں اور میاں فرزند احمد باہر نکلے۔ معظم ادھیڑ عمر کا دراز قد آدمی تھا۔ اُس کے اعضا سے جوانی کے دنوں کی کسرت ٹپکتی تھی مگر جسم کے وسط میں عمر کی نرمی کا قبضہ تھا۔ اُس کی حرکات میں ایک مخصوص اعتماد والی اپنائیت تھی۔ فرزند کا قد درمیانہ اور جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ معظم کے برعکس اُس نے اپنے بال گہرے سیاہ رنگے ہوئے تھے۔ معظم کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ اُس نے دروازے کے ساتھ لگے گھنٹی کے بٹن کو دبایا۔ ملازمہ نے بیٹھنے والا کمرہ کھول کے خواب گاہ میں زہرہ جبیں کو اطلاع دی۔

وہ اُس وقت کچھ پڑھنے میں مشغول تھی۔ زندگی کا موجودہ معیار اُسے معظم نے ہی مہیا کیا تھا۔ زہرہ جبیں کو اپنے لیے اُس کی بے پناہ محبت کا علم تھا۔ وہ بعض اوقات پریشان ہو جاتی کہ اگر کبھی معظم نے اپنی عنایات اور مہربانیوں کا حساب مانگ لیا تو وہ توازن کیسے قائم کرے گی؟۔ اس میں شک نہیں کہ وہ معظم کی داشتہ تھی۔ یہ رشتہ وہ اُس کی مرضی کے بجائے اپنے طریقے سے نباہ رہی تھی۔ بعض اوقات مایوسی اور برہمی معظم کے جسم اور سوچ کا حصہ بن جاتی۔ یہ ایسا وقت تھا جب وہ خائف ہو جاتی۔ معظم اُس لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس خوف میں جسمانی اذیت سے لے کر اُس کی مکمل تباہی شامل تھی۔ پھر یہ امر باعثِ تقویت ہوتا کہ معظم اُسے مٹا کے بالکل تنہا رہ جائے گا۔ اُس کی زندگی بند کمرے میں کھلے اُس گلاب کی طرح تھی جو دھوپ کا خواہاں تھا۔ زہرہ جبیں وہ دھوپ

تھی، جو کھڑکیوں اور دروازوں سے اس طرح چھن رہی تھی کہ گلاب رنگوں کا مجموعہ بن گیا۔ اس دھوپ کی حدت نے اُس کے پیکرِ ماضی پہ ایسے مٹھی چاپی کہ وہ آرام سے ہو گیا۔ یہ ایک مستی کی کیفیت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وقتی ردِعمل اندھا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی زیرک بھی ہوتا ہے۔ معظم کبھی بھی ست رنگے گلاب کو دھوپ سے محروم کر کے کالی کوٹھریوں میں قید نہیں کرے گا۔ بعض اوقات اُس کا اپنا رویہ اُسے پچھتاوے کے بھنوروں میں الجھا دیتا۔ اُس کے اندر سے کمزوری کی نرم کونپل سر اُٹھانے کی کوشش کرتی۔ اسے علم تھا کہ اگر یہ کونپل شاخ بن گئی تو وہ کتنے اور سایوں سے محروم ہو جائے گی۔ اس نے بے اعتنائی کا روپ دھار لیا۔ وہ معظم کی تمام پاسداریوں کے جواب میں بے رخی دکھاتی، مقصد روایتی عورت بن کر اپنے آدمی کو محرومی کی زنجیر سے باندھنا نہیں تھا۔ وہ معظم کے ساتھ قدم ملا کے چل رہی تھی۔ وہ اس کے اندر ترقی کی شدید خواہش کے دیئے میں تیل بنی۔ معظم نے اس پہ زندگی کی دلچسپیوں کے دروازے کھول دیئے۔ اسے ان دروازوں سے ایسے نظارے دکھائے جو اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھے۔ یہ سراب کے حقیقت میں بدل جانے کے مترادف تھا۔ زہرہ جبیں ہمیشہ اپنے ماحول سے اس طرح الگ تھلگ رہی کہ وہ کبھی بھی اپنے خاندان کا حصہ نہ بنی۔ اسے ان سے بے پناہ چاہت تو تھی لیکن زندگی کا معیار اسے بے چین رکھتا۔ اس دلدل پہ تعلیم ہی واحد پل تھا۔ اس نے اپنی تمام توانائی حصولِ علم پہ صرف کر دی۔ زہرہ جبیں کا باپ تعلیم کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پل کے ستون آہستہ آہستہ دلدل میں دھنسنے شروع ہو گئے۔ تب اس کی ملاقات ابرار سے ہوئی۔ زہرہ جبیں کامیابی کی دھوپ میں چمکنا چاہتی تھی۔ اس نے طے کیا ہوا تھا کہ وہ تبدیلی کے لیے تمام ذرائع استعمال میں لاتے ہوئے اپنی الگ حیثیت بھی قائم رکھے گی۔ ابرار کو اس نے ایسا قرب دیا جس میں دوری تھی۔ اس کے علم میں تھا کہ ابرار ایک سہانے خواب میں گم ہے۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ بیدار ہو گیا تو شاید کامیابی کی سنہری دھوپ اس کے چہرے پہ نہ چمکے۔ زہرہ جبیں نے فیصلہ کیا کہ ابرار کو ہوش میں آنے سے پہلے 'بہتر ہے' وہ خود سو جائے۔ اس نے ابرار کو یونیورسٹی کی فیسوں کا معاوضہ ادا کر دیا۔ زہرہ جبیں کو ابرار میں ہمیشہ اعتماد کی کمی اور شکوک کا الجھاؤ نظر آیا۔ وہ اس ڈور کی مانند تھا جو بے انت گانٹھوں کی وجہ سے پتنگ کو صحیح بلندی نہیں دے سکتی۔ ابرار ہمیشہ ڈائری میں تمام اخراجات فوراً درج کر لیتا۔ زہرہ جبیں کو اس نے کاندھے پہ بٹھا کے میلے کا نظارہ تو کرایا مگر وہ اتنی بلندی پر نہیں تھی کہ میلے کی آخری حد تک اُس کی نظر جاتی۔

زہرہ جبیں اُٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ایک نظر اپنے سراپے پہ ڈال کے مطمئن سی وہ بیٹھنے والے کمرے میں آ گئی۔ اسے معظم کے ساتھ قدرے بھاری آدمی کو دیکھ کے حیرت ہوئی۔

''اسلام علیکم۔'' زہرہ جبیں نے بیٹھتے ہوئے دونوں کو مخاطب کیا۔

''تم دونوں ملے تو نہیں لیکن ایک دوسرے کو تفصیل سے جانتے ہو۔'' معظم نے فرزند کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا دوست فرزندِ قربان اور یہ......'' فرزند نے بات کاٹی۔

''ہم نہ بھی ملتے تو متعارف تھے۔'' زہرہ جبیں کا ہلکا سا قہقہہ گونجا۔

''صحیح بات ہے۔'' اس نے رسمی تعارف کو ختم کر دیا۔

معظم نے پیکٹ زہرہ جبیں کے پاس رکھا تو اس ہونٹوں کے کونوں کو چھو کے مسکراہٹ آنکھوں میں منتقل ہو گئی۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے اتھاہ اندھیرے میں لمحے کے لیے روشنی کی ایک کرن لہرا جائے۔

معظم کو اپنے اندر اعتماد کی کمی محسوس ہونا شروع ہوئی۔ اس نے صوفے پہ پہلو بدلا اور اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ فرزند اپنے سامنے دیوار پہ نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

''مجھے ایک ضروری کام ہے۔ تھوڑی دیر تک واپس آتا ہوں۔''

وہ دونوں پہ نظر ڈالے بغیر پورچ میں آ گیا۔ کار چلاتے ہوئے معظم کی عجیب حالت تھی۔ اس نے زہرہ جبیں کے گرد ایسی لکیر کھینچی ہوئی تھی جس کے اندر کسی کو کبھی پاؤں دھرنے نہیں دیا تھا۔ زہرہ جبیں اس کی زندگی کا محور رہی تھی۔ پچھلے چار برسوں میں معظم نے اس کے ساتھ ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ اس لمبے راستے میں اس نے زہرہ جبیں کو جھٹکا تک نہیں لگنے دیا...... آج...... معظم نے

اپنے ہاتھوں سے وہ لکیر مٹا دی۔ وہ دھیمی رفتار سے کار چلاتا رہا۔ اس کے اندر ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ ونڈ سکرین کے باہر سردیوں کی دھوپ بہت ملائم تھی۔ معظم کو بھیتر اور باہر کے موسم میں فرق کا علم نہیں تھا۔ وہ صرف دائروں میں گھومے جا رہا تھا۔ سڑکوں پر لوگ اپنی زندگیوں کے تعاقب میں سرگرداں تھے۔ اسے ان سے کوئی دلچسپی یا رغبت نہیں تھی۔ وہ چہروں پہ بکھرا یکسوئی کا کرب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بینائی سے محروم ہو گئیں تھیں مگر ذات کا اندھیرا باہر ریٹ رہا تھا۔ اس نے کہیں رک جانے کا فیصلہ کیا کیوں کہ دائروں میں گھومنے کی وجہ سے اُسے چکر آ رہے تھے۔ اس کے ذہن میں بار بار زہرہ جبیں کا وہ عکس در آ رہا تھا جو اس نے اُٹھنے سے پہلے دیکھا۔ وہ زہرہ جبیں کے چہرے کے ہر اظہار سے واقف تھا۔ اسے وہاں حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساسات نظر آئے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اسے فرزند کو سونپ آیا تھا۔ کیا وہ واپس چلا جائے؟ اس خیال سے اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ملائم سردی نے اس کے جسم میں کپکپی طاری کر دی۔ اسے اپنی حالت پہ ترس آنے لگا۔ اس نے زندگی میں کئی فیصلے کیے تھے۔ آج کے فیصلے نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ کیا وہ جذباتی طور پر اتنا کمزور ہو گیا ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے بے شمار گھڑیاں ڈھو کے جذبات کا ایک پہاڑ بنایا تھا۔ زہرہ جبیں اس پہاڑ کے ہر جذبے میں آباد تھی۔ کیا پہاڑ آسانی سے ڈھے جاتے ہیں؟ وہ زہرہ جبیں کو اگر فرزند کے حوالے کر آیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ مستقلاً کسی اور کی ہو گئی ہے؟ صرف ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ جذبات تو سدا سلامت رہتے ہیں۔ انہیں توڑا نہیں جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ گئے تو تمام سہارے بھی ختم ہو جائیں گے۔ زہرہ جبیں اس کی ہے۔ فرزند کو وہ وہاں جانے سے روکے گا نہیں لیکن زہرہ جبیں اس کی رہے گی۔

معظم سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کے ذہن پہ چھائی پچھتاوے کی گرد بیٹھنا شروع ہو گئی اور ہر چیز اپنے صحیح تناظر میں دکھائی دینے لگی۔ اس شام وہ فلیٹ کے بجائے گھر چلا گیا۔ ہر لمحہ نیا ہوتا ہے۔ پرانے پھسل کے پیچھے کی سمت کھسک چکے ہوتے ہیں۔ اس نے وہ شام رخشندہ کے ساتھ گزاری۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے شاید لمحوں سے ان کی شناسائی نہیں تھی۔ معظم کو رخشندہ سے کسی حد تک ہمدردی محسوس ہوئی۔ اس نے اگر معظم کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی تو آج وہ بھی یہی کر گزرا ہے۔ دونوں کے ارادوں میں فرق تھا۔ رخشندہ نے خود غرضی کی دھند میں معظم کو گم کیا جب کہ اس نے زہرہ جبیں کو اس کو مقام دکھایا۔ یہ دو مختلف انتہائیں تھیں۔ کیا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا؟ معظم نے ایک دم حقائق رخشندہ کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

’’تم نے جو چھپایا کیا وہ مناسب تھا۔‘‘ معظم کے لہجے میں تلخی تھی

رخشندہ نے قدرے برہمی سے جواب دیا۔

’’اتنے سالوں کے بعد یہ موضوع بے معنی ہو گیا ہے۔ بہتر ہے ہم اپنی زندگیوں کو مزید الجھنوں سے پاک رکھیں۔‘‘

دونوں ایک دوسرے سے بیزار بیٹھے رہے۔ خاموشی جب عفریت بننا شروع ہوئی تو ہو اپنے کمروں میں چلے گئے۔

II

رات کی نیند معظم کے ذہن کے جالوں کو صاف نہ کر سکی۔ وہ اسی طرح الجھنوں میں گھرا دفتر گیا۔ اسے سب سے مشکل مرحلے کا سامنا تھا۔ وہ زہرہ جبیں سے ملنا چاہتا تو تھا مگر رکاوٹ بھی آڑے آ رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دفتر کے اوقات ختم ہونے کے قریب زہرہ جبیں کو بلائے گا۔ اسے مایوسی اور کسی حد تک تسکین ہوئی جب یہ بتایا گیا کہ وہ دفتر نہیں آئی۔ معظم نے سوچا کہ وہ ایک کٹھن مرحلے سے عارضی طور پر بچ گیا ہے۔ دفتر سے نکلنے کے بعد وہ پھر سڑکوں پہ چل نکلا۔ اس نے فلیٹ پر نہ جانے کا فیصلہ کیا، اس طرح وہ فرزند سے نہیں مل سکے گا۔ وہ کار میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ زہرہ جبیں نے اس کے ضمیر کا پرندہ اپنی بے گناہی کے پنجرے میں قید کر لیا تھا۔ وہ اسی طرح بے مقصد گھومتے ہوئے ایک پارک کے پاس جا کر رک گیا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ اندر چلا گیا۔ روشوں پہ گھومتے ہوئے، اسے پھولوں کے رنگ اپنے اندر الجھا گئے۔ اس نے ان رنگوں میں نجات ڈھونڈنا چاہی۔ ہر رنگ ایک مختلف عکس لیے تھا۔ وہ کیاریوں کے پاس کھڑا رہا۔ مسکراتے ہوئے پھولوں کی پرچھائیں اس کے اندر سکون کا مست خرام دریا بن گئیں۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کب اندھیرا ہوا اور قمقمے جلے۔ سردی کی کپکپی نے اسے اس خواب سے بیدار کیا۔ یہ جاگنا اسے پسند نہ آیا۔ باغ ویران ہو چکا تھا۔ وہ سر جھکائے چلتا ہوا کار تک پہنچا۔ اس نے پھر سڑکوں پہ گھومنا شروع کر دیا۔ اچانک اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ اسے خیال آیا کہ وہ تمام زندگی اس احساس سے برسرِ پیکار رہا۔ مگر اب یہ جنگ وہ ہار گیا ہے۔ اس شکست کو جیت میں

بدلنے کے لیے اس نے کئی چالیں تو چلیں لیکن کامیابی تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ زہرہ جبیں نے آتے ہی اس شکست کو کامیابی میں بدل دیا۔ وہ اس تنہائی کو دیمک کی طرح چاٹ گئی۔ معظم کی زندگی کے ہر چہرے پہ سرور کا عکس چھا گیا۔ اب دوبارہ تنہائی کی افواج اس پہ چڑھ دوڑی تھیں۔ اسے ایک وہم سا ہو رہا تھا کہ اس دفعہ وہ ان حملوں کی تاب نہیں لا سکے گا۔ اگر حل ہتھیار پھینکنے میں ہے تو یہ اطاعت مکمل ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ زہرہ جبیں کے گھر چلا گیا۔

وہ گھر میں اکیلی تھی!!

زہرہ جبیں اُسے پرانی گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے ملی۔ فرزند کا ذکر آیا اور نہ ہی اس کی دفتر کی غیر حاضری کا۔ معظم کی شروع والی جھجک آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئی۔ دونوں پرانی باتوں میں گم ہو گئے۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹوں کا جال پھیل گیا۔ اس جال میں سے قہقہے آزاد ہو کے نکلنے شروع ہوئے اور پھر ان پنچھیوں کے بیٹھے سر ماحول کو خوابیدہ کرنے لگے۔ اُنہیں معلوم ہی نہ ہو سکا اور نیند دبے پاؤں اُن کی آنکھوں میں در آئی۔ نیند اُن پہ اِس طور چادر تان گئی کہ وہ کسی کو نظر ہی نہ آئے۔ زہرہ جبیں کے پاس معظم کی الجھن کا حل تھا۔ وہ اُس کی تنہائی کو ختم کر گئی۔ معظم کی پریشانی اور پچھتاوے کی رات میں ایک دفعہ پھر اعتماد کی پھلجڑیاں کھل اُٹھیں۔ زہرہ جبیں نے اُسے دوبارہ تھام لیا۔ اُس کی حالت اُس اندھے کی سی ہو گئی جو کسی اور کی آنکھوں سے دیکھتا ہو۔ پچھلے دو دن کی کشمکش کی بھاپ رات کی ہواؤں میں بکھر گئی۔ معظم کا جسم ذہنی سکون کی تاب نہ لا سکا اور اُس رات اس طرح ٹوٹ کے سکون سے سویا جیسے پیدائش کے بعد بچہ دودھ پی کے سوتا ہے۔

صبح جب معظم بیدار ہوا تو زہرہ جبیں گھر میں نہیں تھی۔ اُس کا اندازہ تھا کہ وہ دفتر چلی گئی ہو گی۔ وہ آہستہ آہستہ تیار ہو کے دفتر چلا گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ تھی کہ بغیر دانت صاف کیے اور شیو بنائے وہ دفتر گیا ہو۔

دفتر کے غسل خانے میں معظم نے یہ دونوں کام مکمل کیے۔

معمول کے کاموں سے فارغ ہو کے اُس نے زہرہ جبیں کو بلوایا۔ شفقت نے زہرہ جبیں کا استعفیٰ دیا جو صبح موصول ہوا تھا۔ معظم پھر دو دن پہلے والی کشمکش کی گرفت میں آ گیا۔ وہ ہمیشہ سوچا

کرتا تھا کہ آدمی کا جسم بوڑھا نہیں ہوتا، بڑھاپا تو ایک علامت ہے جسے ذہن حالات کے مطابق شکلیں دیتا رہتا ہے۔ زہرہ جبیں کا استعفیٰ دیکھ کر اُسے تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اچانک بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ گھر جانے کے لیے اُٹھا تو ہر قدم اُسے دلدل میں دھنسا محسوس ہوا۔ وہ بہت اِحتیاط سے چلتا کار تک پہنچا۔ اُسے بار بار خیال آ رہا تھا کہ یہ تمام ایک غلط فہمی ہے۔ زہرہ جبیں نے استعفیٰ دو دِن پہلے دیا ہوگا۔ رات اُس کے رویے میں مفاہمت کے بجائے اپنائیت کا عنصر تھا۔ اُس نے وارفتگی کے در وا کر دیئے تھے، وہ کسی سے خائف ہونے والی عورت نہیں تھی اور اگر استعفے کے بارے میں سنجیدہ ہوتی تو ضرور بات کرتی۔ یہ شاید فرزند کو اُس کے گھر چھوڑ آنے کا ردِعمل تھا۔ صبح سے وہ دفتر آنا شروع کر دے گی۔ اِس مفروضے نے معظم کو حوصلہ دیا اور کار چلاتے ہوئے اُس کا اعتماد بحال ہو گیا۔

معظم نے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔

حمیدی

III

اُس رات فرزند اپنے ایک دوست کے ساتھ زہرہ جبیں کے گھر گیا۔

وہ تینوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فرزند کا دوست خورشید اقبال چمڑے کی صنعت سے وابستہ تھا۔ یورپ اور امریکہ میں اُس کی تیار کردہ مصنوعات کی بہت مانگ تھی۔ فرزند اور معظم کی طرح دولت کی فراوانی اُس کی ہر حرکت سے ٹپکتی تھی۔ معظم میں وقار کا ٹھہراؤ، فرزند کے ہاں تدبر اور اس کے برعکس خورشید اقبال چھچھورے پن کا شکار تھا۔ یہ اُس اکیلے کا نہیں، اس طبقے کے تمام نمائندوں کا وتیرہ تھا۔ دولت کی بہتات کسی نظام کی وجہ سے نہیں تھی۔ جو دولت معاشی اُصولوں کی پیروی کے صلے میں آئے وہ اس طرح اچانک اور وافر نہیں ہوتی۔ مزید اضافوں کے لیے اُسے بہت احتیاط سے پیداواری پہیے میں گھمایا جاتا ہے اور چھاج سے صاف کی جانے والی گندم کی طرح ایک ایک دانہ سنبھالا جاتا ہے۔ ایسی دولت کے پیچھے صدیوں کی محنت اور احترام ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت انسانی خون اور پسینے کی ارزانی اور خود غرضی سے کی جاتی ہے۔ خورشید اقبال اور اُس کے قبیلے کے دوسرے لوگوں کو دولت انقلاب کی بدولت حاصل ہوئی۔ تقسیمِ ملک نے ان لوگوں کو متعدد ناجائز اور غیر اخلاقی مواقع فراہم کیے۔ اُنھوں نے حق تلفی جائز وسیلہ سمجھا اور نئے ملک کے بکھرے ہوئے وسائل کو ہوس کا نشانہ بنایا۔

خورشید اقبال میں چھچھورا پن اُس کی بے انتہا کامیابی کی وجہ سے تھا۔ معظم اور فرزند ایسے رویوں کو بظاہر پرے دھکیل چکے تھے مگر ایک کمینگی اُن کے اندر بھی آباد تھی۔ وہ ابھی تک خود کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ غربت کی کچی سڑک چھوڑ کے موجودہ راہ پہ چلتے اُنہیں زیادہ عرصہ نہیں ہوا

تھا۔ یہ لوگ ذہنی طور پر غربت کی کالی کوٹھریوں میں آباد تھے۔ اُن کی حالت اُس مسافر کی سی تھی جو رات کو سانپ کے ڈر سے پاؤں پٹختے ہوئے چلتا ہے۔

وہ تینوں رات دیر تک بیٹھے رہے۔ اُن کی گفتگو کسی خاص نقطے پر مرکوز نہیں تھی بلکہ اِدھر اُدھر کے جنسی سکینڈل زیرِ بحث تھے۔ زہرہ جبیں اِن قصوں کو بظاہر دلچسپی سے سنتی رہی لیکن اُس نے کوئی رائے نہ دی۔

فرزند کو کئی دفعہ معظم کا خیال آیا۔ وہ اُس کا قریب ترین دوست تھا اور اُس کے دامن میں معظم کے لیے عزت تھی۔ اُسے معظم کی دماغی صلاحیتوں کا علم تھا۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ معظم اُسے زہرہ جبیں کے گھر کیوں لایا۔ فرزند کو معظم کے زہرہ جبیں کے بارے میں احساسات کا علم تھا۔ تعارف کروانے کے بعد اُس کا اُٹھ جانا ایک واضح اشارہ تھا لیکن فرزند ابھی تک الجھن میں گرفتار تھا۔ کیا معظم چاہتا تھا کہ وہ زہرہ جبیں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرے؟ معظم کی خواہش تھی کہ وہ زہرہ جبیں کو قیمتی تحائف دینے کے علاوہ مختلف لوگوں سے بھی متعارف کراتا رہے۔ آج بھی اُس نے یہی کیا۔

خورشید اقبال اُن کا دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گھٹیا آدمی تھا۔ فرزند جانتا تھا کہ خورشید اقبال زہرہ جبیں کے ہاں رات گزارنا پسند کرے گا۔ اگر ایسی کیفیت پیدا ہوئی تو اُسے کیا کرنا چاہیے! اُن کی گفتگو جاری رہی۔ اُس نے محسوس کیا کہ زہرہ جبیں مصنوعی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے۔ خورشید اقبال دوہرے مقصد کے حصول کے لیے اپنے قصوں میں گم ہے۔ وہ گفتگو چلاتے ہوئے زہرہ جبیں کو متاثر بھی کرنا چاہتا تھا۔ خورشید نے اندازہ لگایا کہ اس عورت کے ساتھ جلد بازی نقصان دہ ہے چناں چہ اُس نے زہرہ جبیں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے مبالغہ آمیز گفتگو جاری رکھی۔ فرزند نے معظم کی خواہش کو تکمیل تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ زہرہ جبیں کو خورشید اقبال جیسے لوگوں سے بھی بچانا تھا۔ اِس کی نوبت نہیں آئی۔ خورشید اقبال نے خود ہی جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فرزند فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

''بات چیت دلچسپ رہی۔ کسی دن طویل ملاقات کے لیے اکیلا آؤں گا۔'' خورشید اقبال نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

IV

اگلے دن معظم کو دفتر میں زہرہ جبیں کا انتظار رہا۔

شام والے تمام مفروضے اُس کے ذہن میں مزید الجھنیں پیدا کرتے رہے۔ اُسے خیال آیا کہ وہ کچھ عرصہ سے اپنے کاروبار کو نظر انداز کر رہا ہے۔ اُس نے اپنی فیکٹریوں کا چکر لگایا، نہ پیداواری سطح اور نہ خام مال کی کھپت کی رپورٹوں کو دیکھا۔ اُسے حیرت ہوئی کہ اُس نے کبھی بھی اپنے کاروبار کو اس طرح پسِ پشت نہیں ڈالا تھا۔ اُسے زہرہ جبیں اور اپنا کاروبار دونوں عزیز تھے۔ آج دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ اُسے اچانک احساس ہوا کہ وہ انہیں کھو بیٹھے گا۔ معظم کو یقین تھا کہ وہ یہ نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے اپنے منتشر اور اُلجھے ہوئے خیالات ایک کمزور آدمی کی میراث نظر آئے۔ اُس کے دماغ میں اچانک خون کی رسد مکمل ہوگئی۔ پچھلے چند دنوں کی اعصاب شکن الجھنوں کو اُس نے ذہن سے جھٹک کر باہر پھینک دیا۔ اُسے چنگھاڑتی ہوئی، ایک سیاہ چڑیل، کھڑکی پھلانگتی نظر آئی۔ اپنے دفتر کی سجاوٹ اور اہمیت کا غرور نظروں میں گھوم گیا۔ وہ شام تک اپنے کام میں مصروف رہا۔

معظم تھکا دینے والے دفتری عمل کے بعد باہر نکلا تو صحت مند بچے کی طرح شگفتہ تھا۔ وہ سیدھا زہرہ جبیں کے گھر گیا۔ وہ جیسے اُس کی منتظر تھی۔ اُسے دیکھ کر تیزی سے چلتی اُس کے پاس آئی۔ معظم نے سوچا کہ اُس نے زہرہ جبیں کو کبھی تیز چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اُسے تیز چلتے دیکھ کر یہی احساس ہوا کہ وقت تھم گیا ہے۔ وہ قریب آ کر رُکی۔ اُس کی آنکھوں میں روشنی رقص کر رہی تھی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہ چند لمحے صدیوں پہ بھاری تھے۔ زہرہ جبیں نے آہستہ سے صدیوں کی دھند میں سے سر نکال کے معظم کی چھاتی کے ساتھ لگا دیا۔ معظم اُس کے بالوں کو سہلاتا رہا۔

دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

زہرہ جبیں نے ملازمہ کو بلایا۔

’’ہر مہمان کو بتا دینا کہ میں فارغ نہیں۔‘‘ اُس نے ملازمہ کو تاکید کی۔

لفظ مہمان معظم کے دل کو چیر گیا۔ کیا زہرہ جبیں نے ارادتاً بات کی تھی؟

اُن کے لیے وقت اہمیت کھو بیٹھا۔ اُنہیں پتا ہی نہ چل سکا کہ وہ کب تکلف کی پگڈنڈی پر چلتے اختلاط کی راہ پر نکل آئے۔ معظم اس راستے پہ چلتے کئی نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر اُس کے لاشعور میں شکوک بھی تھے۔ وہ خوش گوار اور دلچسپ ماحول کو برقرار رکھتے ہوئے مناسب وقت پر متنازع موضوعات کو بھی بیچ میں لانا چاہتا تھا۔

’’مجھے ایک مشورہ دو۔‘‘ اُس نے زہرہ جبیں کے پاؤں کی انگلیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

زہرہ جبیں نے مسکراتے ہوئے ماتھے پہ بل ڈال لیے۔ اُس کی آنکھوں میں کوئی اُلجھن نہیں تھی۔ مسکراہٹ سے دلچسپی ٹپک رہی تھی۔ اُس نے اثبات میں سر ہلا کے معظم کو بات جاری رکھنے کو کہا۔

’’میں تمہارے ہاں منتقل ہونا چاہتا ہوں۔‘‘ معظم نے ہر لفظ ناپ تول کر ادا کیا...... زہرہ جبیں اُسی طرح مسکراتی رہی۔

’’اچھی بات ہے۔ میری حفاظت ہوتی رہے گی۔‘‘ وہ قہقہہ لگا کر اچانک سنجیدہ ہو گئی۔

’’آپ ضرور آ جائیں۔ لیکن ہفتے میں تین دن۔‘‘ معظم کو یہ رخ پسند نہ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ زہرہ جبیں جنگ کے لیے تیار ہو گئی ہے۔ اُس کا ذہن اور جذبات مسلسل ایسے زاویے پہ ٹکراتے رہے تھے کہ اُسے اپنی ہستی گرد کا غبار بن کے ہوا میں معلق محسوس ہوتی۔ کچھ دیر پہلے والا اعتماد ساتھ چھوڑ گیا۔ زہرہ جبیں کی گرفت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ تمام فیصلوں کی گرہیں کھلنے لگیں۔

’’کیوں؟‘‘ اپنے کمزور دفاع میں وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ انسانی ذہن ایک وقت میں کئی مسائل سے اُلجھ سکتا ہے۔ اُسے اچانک محسوس ہوا کہ اُس کا ابتدائی فیصلہ درست تھا۔ کسی طاقت نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس کو اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیے۔ زہرہ جبیں اُس کے چہرے پر کشمکش کی تحریریں پڑھ رہی تھی۔ اُس نے معظم کی آنکھوں میں فیصلے کی سختی محسوس کی۔ وہ اپنے لہجے میں مٹھاس لے آئی۔

’’بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں۔ آپ کا ایک مقام ہے۔ روزانہ یہاں دیکھے جانا کئی افواہوں کو جنم دے سکتا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ معظم نے بھی مکاری کا لبادہ اوڑھ لیا۔

’’متبادل دن ہم اکٹھے گزاریں گے۔‘‘

زہرہ جبیں ایک دم مسکرا دی۔

’’تم نے استعفیٰ کیوں دیا۔‘‘ معظم اپنی کمزوری پر قابو پا چکا تھا۔ وہ گفتگو اپنے دائرے سے نکال کر زہرہ جبیں کے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔

’’آپ کو علم نہیں ہو سکا؟‘‘ وہ اتنا دھیما بولی کہ معظم کو سننے میں دشواری ہوئی۔ اُسے محسوس ہوا کہ زہرہ جبیں کی اس مٹھاس میں ناگن کی چال کی سرسراہٹ تھی۔ وہ محتاط ہو گیا۔

’’نہیں!۔‘‘

’’میں تھک گئی تھی۔ دفتر کی اتنی کڑی Routine میرے بس سے باہر تھی۔‘‘

معظم کو یہ جھوٹ ایک کَسی ہوئی کمان سے نکلے تیر کی طرح لگا اس نے درد کی شدت کو آنکھیں بند کر کے سہنا چاہا مگر کسی بھی انسانی رویے سے یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ چہرہ سپاٹ رکھے بیٹھا رہا۔ اُس نے بات کو آگے چلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں دونوں جھوٹ کی آنکھ مچولی کھیلتے سچ کے دالان میں آمنے سامنے نہ کھڑے ہو جائیں۔

معظم نے ہاتھ بڑھا کے زہرہ جبیں کے بالوں کو چھوا۔ اُس نے معظم کا ہاتھ اپنی انگلیوں میں لے کر سیدھا کیا اور لکیریں پڑھنے لگی۔

’’ہاتھ پڑھنا جانتی ہو؟‘‘ معظم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

’’صرف شادی اور بچوں تک۔‘‘

’’تو بتاؤ!‘‘ معظم کے لہجے میں دلچسپی تھی۔

’’نہیں!‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’دست شناسی کے علم سے میرا ذاتی مشاہدہ زیادہ ہے۔‘‘

وہ سنجیدگی سے ہاتھ کو مختلف زاویوں سے دیکھے جا رہی تھی۔

’’تمہاری ذاتی واقفیت اور مشاہدے کے علاوہ بھی کچھ اور ہے۔‘‘ اس دفعہ معظم کے لہجے میں دلچسپی کے برعکس شدت تھی۔

’’ہوں!‘‘ وہ ہاتھ دیکھے جا رہی تھی۔

’’کیا ہے؟‘‘ معظم نے قدرے سختی سے پوچھا۔

زہرہ جبیں نے تھوڑا آگے سرک کے، اُس کے چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

’’اگر میں دست شناسی کر سکتی تو حضور کی لکیروں میں کیوں گم ہوتی!‘‘

معظم آرام سے ہو گیا۔ اُس نے چہرے کو تھامے ہوئے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

کچھ دیر بعد زہرہ جبیں نے آنکھیں جھکا کر چہرہ چھوڑ دیا مگر معظم اُسی طرح ہاتھ پکڑے بیٹھا رہا۔

رات اُن کی طرح چپ تو تھی مگر دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ شاید کمرے میں گھس کر خود کو اُن کے سامنے برہنہ کرنا چاہتی تھی۔ دیواریں اُنہیں پناہ میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ رات سے خائف نہیں تھے۔ رات اُن کی ہم راز تھی۔ اُس نے دن کے آگے کو بڑھتے ہوئے گھوڑے کی باگ تھام کے اُسے روک لیا تھا۔ رات سے شناسائی کے باوجود اُنہیں اُس پر اعتماد نہیں تھا۔ مصنوعی روشنی کی بارش رات کی چادر کو گیلا کر کے سر سے سرکا رہی تھی۔ رات کیا ہے؟ صرف اندھیرا یا اس کے علاوہ بھی کچھ اور؟ اُنہیں معلوم نہیں تھا کہ رات کا اپنی زبان اور لہجہ ہوتا ہے۔ وہ خاموش بیٹھے اُس کی سرگوشی سن رہے تھے۔ اُس سرگوشی کے کئی انگ تھے۔ وہ سرگوشی ایک لے بن جاتی جس کا

سم کھو گیا ہے اور پھر ایک بھیانک چیخ اُن پہ لرزہ طاری کر دیتی تو ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھام لیتے۔ اُنہیں خدشہ تھا کہ اگر رات اُن کے درمیان حائل ہو گئی تو یہ چیخ اُن کی ہستیوں کو ناکارہ کر دے گی۔ وہ ابھی ناکارہ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان کے کئی فیصلہ طلب مسائل تھے۔ اگر رات نے انہیں جدا کر دیا تو دن کا سامنا کیسے کریں گے!! دن میں دودھ اور پانی کے فرق کو ظاہر کرنے کی اہلیت ہے۔

وہ ایک دوسرے کو تھامے رہے کہ رات، کوئی درز نہ پا کر، واپس پلٹ جائے۔

صبح کی کرنوں نے اُنہیں جگا دیا۔

V

معظم ہفتے میں تین دن زہرہ جبیں کے ہاں گزارتا۔

سرکشی کی جگہ اب آہستہ آہستہ عقل کا اعتدال آ رہا تھا۔ زہرہ جبیں کے ہاں جانے والے دن وہ کچھ وقت فرزند کے پاس گزارتا۔ دونوں باہمی دلچسپی کے معاملات پر گفتگو کرتے۔ زہرہ جبیں کے ہاں فرزند کی آمد و رفت یا اس کا استعفیٰ کبھی زیرِ بحث نہیں آیا۔ معظم نے فرزند کو زہرہ جبیں کے گھر جانے کا طے شدہ فیصلہ بتا دیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد صرف یہ تھا کہ دونوں ایک ہی وقت وہاں موجود نہ ہوں۔

معظم کی طبیعت میں اضطرار نہیں رہا تھا۔ اطمینان، اس کے جسم کی زبان میں ڈھل گیا۔ زہرہ جبیں جب دفتر میں کام کرتی تھی تو بہت سی چیزیں ان کے درمیان حائل تھیں۔ دفتر اور اس کے معاملات بذاتِ خود سب سے گہری خلیج تھے۔ اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ معظم اور زہرہ جبین ہر لمحے کو یادگار بنانا چاہتے تھے۔ معظم کو کبھی کبھی احساس ہوتا کہ یہ زندگی عارضی ہے۔ اس نے سکون حاصل کرنے کے لیے کئی سہارے ڈھونڈے تھے لیکن صحراؤں کی بے نشان منزلیں دور رہیں۔ اس قرب نے ان کے تعلق کو ایک واضح سمت دے دی تھی۔ وہ ان بچوں کی طرح تھے جنہیں آپس میں لڑتے ہوئے ایسا کھلونا مل گیا ہو، جو دونوں کو پسند ہے۔ وہ مطمئن ہوتے ہوئے بعض اوقات ایک اجنبی سے خوف کا شکار ہو جاتے۔ جب بھی انہیں ایسا وہم گھیرتا وہ ایک دوسرے کو اور مضبوطی سے تھام لیتے۔

ایک شام جب معظم، زہرہ جبیں کے گھر گیا تو وہاں ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں میں سلگتا ہوا اور انگلیوں میں ان جلا سگریٹ تھامے تھا۔ معظم کو محسوس ہوا کہ وہ بند آنکھوں کی کسی درز سے اسے دیکھ سکتا ہے۔ جب وہ اندر داخل ہوا تھا تو اس نے اپنے سر کے زاویے کو ہلکا سا موڑ دیا تھا۔

''یہ عبدالمجید صاحب ہیں۔'' زہرہ جبیں نے تعارف کرایا۔

معظم نے دوبارہ اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے زندگی میں اتنا بھاری آدمی نہیں دیکھا تھا۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں جل کے بجھنے کو تھا۔ اس نے انگلی والا سگریٹ سلگا کے پہلے سگریٹ کو بجھایا۔ پاس رکھی تین ڈبیوں میں سے ایک سگریٹ نکال کے انگلیوں میں تھام لیا۔ معظم اُلجھن میں تھا کہ ہاتھ ملانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے کہ عبدلمجید نے سر کے خفیف اشارے سے مسئلہ حل کر دیا۔

''عبدالمجید صاحب! یہ......'' زہرہ جبیں نے تعارف کا دوسرا سرا سوئی میں سے گزارنا چاہا۔

''معظم علی خاں مشہور آدمی ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں۔'' معظم کو محسوس ہوا کہ وزن اور سگریٹوں نے عبدالمجید کے پھیپھڑوں کو کافی نقصان پہنچایا ہوا ہے۔

''عبدالمجید صاحب مشہور سیاست دان ہیں۔'' معظم کو مایوسی ہوئی۔

''آپ کا تعلق کس جماعت سے ہے۔''

''جماعتوں سے موقع پرستوں کا تعلق ہوتا ہے۔ میں سیاست دان ہوں۔''

یہ منطق معظم کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ تشریح کے لیے منتظر ہو گیا!

عبدالمجید اسی طرح بیٹھا رہا۔

''میں اس فرق کو سمجھ نہیں سکا۔'' آخر کو معظم کا تجسس حاوی ہوا۔

''سیاست ایک کھیل ہے، پیشہ نہیں۔ اسے کھیل کی طرح کھیلنا چاہیے، چند حدود اور ضوابط کے اندر۔ مشہور مقولہ کہ سیاست میں کوئی شے بھی حرفِ آخر نہیں، غلط ہے۔ سیاست کا ایک آخری خط ہے، جو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سیاست مفاد کے دائرے میں داخل ہو۔ ہمارے تمام

سیاست دان طاقت میں آنے کے بعد مزید سیاست کے نااہل ہو جاتے ہیں۔ جو ابھی تک طاقت میں نہیں آئے وہ بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتے ہیں جس طرح ڈوبتا خود کو بچانے کے لیے۔ یہ دراصل Anti-Polictics ہے۔ میری سیاست نظریات یا مفادات پر مبنی نہیں۔ چیدہ چیدہ افراد پر مشتمل ایک پوُل اور اس کے متوازی خطوط پر ایک کمیٹی ہو۔ یہ کمیٹی ملک کے اعلیٰ ترین عہدے کے لیے اس پوُل سے لوگوں کو اہلیت کے مطابق نامزد کرتی رہے۔ گندی مچھلیاں بھی لازماً ہوں گی جن کی جگہ بہتر لوگ Induct ہوں گے۔ اس طرح یہ پوُل ہمیشہ موثر اور تازہ رہے گا۔''

عبدالمجید نے انگلیوں والا سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دیا اور پہلا بجھا دیا۔ انگلیوں میں نیا سگریٹ تھام کے صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ معظم نے دیکھا کہ اس طویل گفتگو سے عبدالمجید کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے جسم میں حرکت تو ہوئی مگر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔

''جماعتیں سیاست کو کرپٹ کر رہی ہیں۔ یہ، دراصل گروہوں میں بٹی، اپنے گروپ کو پروان چڑھانے میں یقین رکھتی ہیں۔ جب ایک جماعت طاقت میں آئے تو دوسری جماعتوں کے بے شمار لوگ ان کے ساتھ آ ملتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوئی جماعت نہیں ہوتی اور پوُل کے اندر یہ گھٹ کے مر جائیں گے...... جماعتوں کو ختم کر دینا چاہیے......۔''

''مگر عبدالمجید صاحب کل آپ کہہ رہے تھے کہ پارٹیاں ہی سیاستدانوں کی Breeding Grounds ہیں۔ ان کو Grass Root کی سطح سے لوگوں کو اُوپر لانا چاہیے۔'' زہرہ جبیں نے بات کاٹی۔

عبدالمجید نے سگریٹوں کی کارروائی دہرائی، نہ اس کے چہرے پہ کوئی تاثر آیا اور نہ ہی اُس نے آنکھیں کھولیں۔

''مرزا جان! تمہارا کل کا مہمان جاگیردار تھا۔'' معظم کو ایک دم تازیانہ لگا۔ اس کی روح تک درد سے بلبلا اُٹھی مگر چہرہ سپاٹ رہا۔ زہرہ جبیں کے پاس سیاست دان اور سیاسی پنڈت آ رہے تھے۔ کیا عبدالمجید...... اور مرزا جان......

''اس کے تخیل کی اُڑان ایک شاخ سے دوسری تک تھی۔ یہ رکے ہوئے لوگ ہیں۔ انہیں سیاست سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ جاگیردار صرف جاگیردار ہے، نہ وہ سیاست دان ہے نہ خاوند، باپ نہ بھائی۔ وہ پوُل والے تصور کی Dynamisam کو رد کر دے گا کیوں کہ یہ اس کے لائحہ عمل کے منافی ہے۔'' معظم کو احساس تھا کہ عبدالمجید کمرے کی ہر چیز اور چہروں کے تاثرات دیکھ رہا ہے۔

عبدالمجید کا سانس پھول گیا تھا۔ اس نے صوفہ سے ٹیک لگا لی۔ معظم جب سے آیا تھا عبدالمجید نے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ معظم نے زہرہ جبیں کی طرف دیکھا جو دونوں سے بے نیاز بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے کی شکنیں ذہنی اُلجھن کی طرف اشارہ تھیں، اور معظم اس تاثر سے آشنا تھا۔ عبدالمجید نے سگریٹوں کا تبادلہ کیا اور بڑی مشکل سے پھیپھڑوں سے ہوا نکال کے تازہ اندر داخل کی۔

''پچھلی ملاقاتوں میں آپ نے کہا تھا کہ اسے ختم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ کچھوے کی طرح ہے۔ اُسے کوئی جلدی نہیں کیوں کہ اُس کے تحفظ کا نظام اُس کے اپنے اندر موجود ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے آہستہ آہستہ کیے جاتا ہے، اپنا ارادہ ظاہر کیے بغیر۔''

''مرزا جان! کچھ علاج بہت طویل ہوتے ہیں لیکن انہیں جاری رکھنا چاہیے۔ اگر مکمل آرام سے پہلے انہیں بند کر دیا جائے تو مرض دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ دوا دارو کا جاری رہنا ہی علاج ہے۔'' عبدالمجید نے ایک لمبی سانس کھینچی اور پوری آنکھیں کھول دیں۔ معظم کو وہاں لاتعلقی اپنی تمام تر برہنگی کے ساتھ نظر آئی۔ وہ کانپ اُٹھا۔ اس نے سوچا کہ زہرہ جبیں کیسے لوگوں میں گھر گئی ہے۔ پھر اسے تقویت ہوئی کہ وہ خود کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔

''سب سے پہلے ہمیں تمہارے کل کے مہمان کو غیر موثر کرنا ہوگا۔ اس کے لیے واحد ہتھیار معظم صاحب ہیں اور تمہیں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔''

معظم کو حیرت ہوئی کہ اتنا بھاری آدمی کمال پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''پرسوں آج کے وقت ملاقات ہوگی۔'' وہ کسی قسم کے الوداعی تکلفات کے بغیر رخصت

ہو گیا۔

معظمؒ نے سوچا کہ عبدالمجید کو زہرہ جبیں کے معمولات کا علم ہے۔ یہ ان کے تعلقات میں قرب کی نشانی تھی۔ اسے خیال آیا کہ زہرہ جبیں کی زندگی میں کیا ہر آدمی اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ؟ کیا دیگر مردوں سے تحائف وصول کر کے اس کی آنکھیں انجانے دیاروں کی سیاحت میں کھو جاتی ہیں؟

عبدالمجید کے رخصت ہو جانے کے بعد انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

اگلی دفعہ جب معظم زہرہ جبیں کے گھر گیا تو عبدالمجید وہاں موجود نہیں تھا۔ معظم نے سکھ کا سانس لیا۔ اسے عبدالمجید سے کوئی شکایت تو نہیں تھی لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکا تھا۔ اسے تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی کہ وہ اپنے تجسس کو کوئی شکل نہیں دے سکا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔

عبدالمجید تھکا تھکا سا تھا۔ وہ اُسی طرح صوفے پر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ زہرہ جبیں اس کے لیے سگریٹ کی تین ڈبیاں لے آئی۔ عبدالمجید نے ڈبیاں ٹٹولیں اور اُوپر والی سے سگریٹ نکال کے ایک ہونٹوں اور ایک انگلیوں میں تھاما۔ زہرہ جبیں کا ڈبیا لا کر رکھنا معظم کو ان کے قرب کی ایک اور کڑی لگا۔ معظم نے دیکھا کہ عبدالمجید سگریٹ کا کش نہیں لیتا بلکہ اسے ہونٹوں میں دبائے رہتا ہے۔ سگریٹ کی راکھ اس کی قمیص پر سامنے گرتی رہتی ہے۔

''مجھے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔ عموماً میں اپنے معمولات میں وقت کی پابندی کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔''

عبدالمجید نے پھیپھڑے خالی کیے تو راکھ پیٹ کے اوپر قمیص پر بکھر گئی۔

''میں نے آپ کو اپنے متعلق زیادہ نہیں بتایا۔ تعارف کے ساتھ نظامِ اوقات بھی بتاتا جاؤں گا۔ میں سیاست دان ہوں اور یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔ صبح دس بجے گھر سے نکل کر پہلے دفتر جاتا ہوں۔ شہر کی ویگن سروس کے ڈرائیوروں کی انجمن کا صدر ہوں۔ ایک بجے تک ان کے معاملات نمٹانے کے بعد دوسرے دفتر کو چل پڑتا ہوں۔ میں رکشا ڈرائیوروں کی یونین کا صدر بھی ہوں۔ چار بجے تک ان کے مسائل حل کرتا ہوں۔ چار سے سات بجے تک گھر رہتا ہوں۔ آرام اور لباس تبدیل کیا۔ سات بجے کے بعد سٹاک ایکسچینج میں کچھ وقت گزارتا ہوں۔ میں سٹاک مارکیٹ میں طلب گار لوگوں کو ضروری اطلاعات فروخت کرتا ہوں، بغیر کوئی ذمے داری قبول کیے۔ پھر ایسی جگہوں پر جاتا ہوں جہاں سیاست دانوں یا ان کے نمائندوں سے ملاقات ہو سکے جیسے یہاں مرزا جان کے اڈے پر۔''

عبدالمجید نے لمبی سانس لے کر سگریٹوں کا تبادلہ کیا۔

''میں سیاست دانوں سے اپنے وقت کی قیمت وصول کرتا ہوں۔ انہیں الیکشن میں کامیابی دلانے سے لے کر وزیر بنانے تک۔ الیکشن میں شکست بھی دلواتا ہوں اور اپنے ہی بنوائے وزیروں کے خلاف بعض اوقات، معلومات فراہم کر کے مقدمے بھی بنواتا ہوں۔''

معظم اور زہرہ جبیں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ معظم نے ایک مختصر سے لمحے میں عبدالمجید کو ادھ کھلی آنکھ سے دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے دیکھا۔

''تمام کاروباری اداروں اور صنعتوں میں میرا ایک الگ گروپ ہے۔ یہ لوگ کسی نظریے کے حامی نہیں۔ وہ نظریۂ ضرورت کے تحت کام کرتے ہیں۔ انہیں بہت سخت ہدایات ہیں کہ کوئی فیکٹری یا ادارہ بند نہیں ہونے دینا لیکن اپنی اہمیت اس طرح قائم رکھنی ہے کہ انتظامیہ یا نظریاتی یونینیں ہمارے بغیر فعال نہ ہو سکیں۔''

معظم کو اچانک خیال آیا کہ اس سوچ کا ایک گروپ اس کے ہاں بھی سرگرم عمل ہے۔ ان کے عہدیدار مذکرات میں ہمیشہ اعتدال کا توازن قائم رکھتے ہیں اور اپنی مانگیں پوری کرانے کے لیے دباؤ سے زیادہ منطقی دلیلوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جہاں تک اسے یاد تھا، اپنے اس رویے کی وجہ سے وہ اکثر اپنا نقطہ نظر منوا لیتے۔

''اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔'' عبدالمجید کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے پاس رکھی سگریٹ کی ڈبیوں کو چھوتے ہوئے صوفے پر اپنی جگہ بدلی۔ معظم نے دیکھا کہ اس کا رخ پہلے کی طرح کسی خاص طرف نہیں تھا۔

''ہمارے ہاں سیاست چلی نہیں۔ میں کہوں گا ناکام ہو گئی۔ یہ نہیں کہ سیاست اُصولوں کے تحت ہوتی ہے بلکہ بے اُصول لوگ اس میں آ گئے ہیں۔ یہ مزاروں پہ بکنے والے جھنڈاری ہو گئی

ہے۔ اس میں ہر جنس ڈالی جاتی ہے جو پکنے کے بعد اپنا ذائقہ برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ سیاست دان ''حرف آخر'' والی سوچ پر گامزن رہے اور جماعتیں تبدیل ہوتی رہیں۔ یہاں سیاست دانوں یا جماعتوں کے نظریاتی اُصولوں کی نفی ہوگئی۔ اس سوچ کے ردِعمل میں کوئی بھی نظریہ پنپ نہ سکا۔ کئی سال ملک بغیر کسی مستند آئین کے چلتا رہا۔ جب ایک نظام کسی آئینی شکل کے تحت لایا گیا تو اکثریتی حصے کو ایک اہم حق سے محروم کر دیا گیا۔ دراصل یہ ملک کے معرضِ وجود میں آنے کی بنیاد میں نقب تھی۔ یہیں سے ایسی سوچیں اندر جانا شروع ہوگئیں جنہوں نے ملک توڑ کے دم لیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔''

عبدالمجید نے ڈبیا سے انگلی اور پھر وہاں سے ہونٹوں میں سگریٹ تبدیل کیے۔

''اس تمام مکالمے سے میرا کیا تعلق ہوسکتا ہے!'' معظم نے اکتاہٹ سے پوچھا۔

''ہوسکتا نہیں...... ہے!'' عبدالمجید نے سکون سے جواب دیا۔

''کیسے۔''

''آپ سنتے جائیں...... خود ہی جان جائیں گے۔''

معظم خاموش رہا۔ زہرہ جبیں اس کے پاس بیٹھی تھی اور اسے یہی قرب چاہیے تھا۔ عبدالمجید اپنی باتیں ختم کرکے اُٹھ جائے گا۔

''یہاں تین عوامل بہت اہم رہے ہیں۔ فوج، بیوروکریسی اور سیاست دان۔ اہم ترین عمل یعنی عوام کو Have Nots میں گردانا جاتا ہے۔ فوج اور بیوروکریسی کچھ عرصہ سے متحارب رہے۔ فوج کے پاس تمام اوزار تھے۔ بیوروکریسی کے پاس ایک ہتھیار تھا اور وہ تھا جوڑ توڑ پر مبنی موقع شناسی...... انہوں نے بظاہر میدان میں تولیہ پھینک کے فوج کو آگے بڑھنے کا موقع دیا مگر اپنے ہتھیار کو زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔ چیدہ چیدہ بیوروکریٹ طاقت کے دستِ راس بن گئے۔ ان کی باقیات اب تک حکومتوں کے ہر فیصلے کو سراہ رہی ہیں۔ فوج کو ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جو ہر قسم کی اطلاعات کا موازنہ کرکے ان کے نتائج حکومت کو بہم پہنچائے۔ ایسے حساس ادارے کا وجود تو تھا، اس کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ ادارہ بتدریج پھلتا پھولتا رہا، یہاں تک کہ

ملک کی سب سے طاقت ور تنظیم بن گیا۔ یہ حکومت کے اندر ایک اور حکومت ہے۔ حکومتیں گرانے کے لیے اس نے راہیں ہموار کرلیں، مشہور ہوائی حادثہ بھی اس کے کسی شعبے کی کارگزاری ہوسکتا ہے۔ بعد کی سیاسی حکومتیں بنانے اور ان کو انجام تک پہنچانے میں اسی کا ہاتھ ہے۔''

عبدالمجید نے سگریٹوں کا عمل دہرایا۔

''جب ملک بنا تو یہاں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جو سوائے اپنے حصے کے کچھ نہیں چاہتے تھے اور دوسرے جو ہر ایک کے حصے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں بیوروکریسی نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ انہوں نے غلط کو غلط نہیں بلکہ صحیح کہا۔ یہیں سے ملک بھول بھلیوں میں گم ہو کے کمزور اور جانبدار گورنس کی نظر ہوگیا۔ سیاست دان ابھی اتنے اہل نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس لاوے کے بہاؤ کو روک سکتے۔ ان کی ناتجربہ کاری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کمانڈر ان چیف کو وزیر دفاع بنا کے ملک کے سیاسی ارتقا کو روک دیا۔ بعد میں اُس کے پسندیدہ بیوروکریٹس نے چند ایک منفرد کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ ان میں سیاسی جماعتوں کا قلع قمع اور طبقاتی خلیج کو مزید وسیع کرنا تھا۔ ہم اور آپ بھی اسی کی پیداوار ہیں۔''

عبدالمجید کا لہجہ پہلی دفعہ غیر سنجیدہ ہوا۔

''یہ تمام حقائق ہیں۔ میرا ان سے کسی قسم کا تعلق جڑا نہیں۔'' معظم نے ایک دفعہ پھر اکتاہٹ سے کہا۔

''آپ سنتے جائیں...... مجھے موقع دیں۔'' عبدالمجید نے تحمل سے جواب دیا۔

''یہ وہ وقت تھا جب فوج کے کردار میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ فوجی سربراہ کی نظر میں دو عہدے سما گئے۔ سوائے چند ایک کے تمام نے دونوں عہدے سنبھالے۔ ملک کا سب سے بڑا حساس ادارہ اَب فعال ہوگیا تھا۔ اُس کا ہدف سیاستدان بھی تھے اور یہ سچ ہے کہ اُس نے اُنہیں تگنی کا ناچ نچایا۔''

عبدالمجید نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ آدھا سگریٹ اُس کے ہونٹوں سے لٹک رہا تھا۔

”اَب میں مختلف پہلوؤں کو ایک ایک کر کے آپ کے سامنے رکھوں گا...... ہمارا جھکاؤ امریکہ کی طرف رہا اور وہی معاشی طور پر ہمیں استحکام دیئے ہوئے تھا۔ ملکی صنعت اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کی کوشش میں تھی۔ اس تناظر میں پہلا کمانڈر ان چیف اپنے تمام تر کرومز کے ساتھ سٹیج پہ آیا۔ اس نے بیوروکریٹوں کی ایک ٹیم ترتیب دی۔ اُس ٹیم میں بڑے نام شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہر اس نظریے کی تائید کی جو فوجی نقطہ نظر کا حامی تھا۔ اُنھوں نے دولت کو پھیلانے کے بجائے سیکٹر نے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں بائیس خاندان معرض وجود میں آئے۔ اُن کا نظریہ تھا کہ دولت غریبوں تک پہنچنے کے بجائے چند ایک ہاتھوں میں ہو جہاں سے وہ چھوٹے چھوٹے سوارخوں سے باہر نکلتی رہے، پانی کے قطروں کی طرح، اور پھر ایک لہر بن کے ہر سو پھیل جائے۔ دولت سمٹنے کے بعد سمٹی ہی رہی۔ جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں صرف چند لوگوں نے فائدہ اُٹھایا...... ہم بھی ان میں شامل ہیں۔“

عبدالمجید نے سگریٹ بدلے۔

”دوسرے آمر کا دور ایک سیاہ حاشیے کی مانند تھا۔ پہلے منتخب وزیراعظم نے اقتدار سنبھالا تو اس کے پاس ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے متعدد Options تھے۔ بیوروکریسی کے تعاون سے اُس نے ایسا حل نکالا جس نے معیشت کو ایسی دلدل میں دھکیل دیا جہاں سے ابھی تک نکلنا ممکن نہیں ہو سکا۔ اُس نے چند اہم صنعتوں کو قومیا لیا...... سوویت یونین بھی نیشنلائزیشن کی اندھی غار میں راستہ بھٹک گیا تھا۔ ہماری معیشت اُس نوزائیدہ بچے کی طرح تھی جس کے پھیپھڑے خراب ہوں اور وہ آکسیجن Tent کا مرہون منت ہوتا ہے۔ قومیائے جانے کے اس عمل نے زندگی کا واحد سہارا یعنی بقا کا خیمہ اُس کے اُوپر سے اُٹھا لیا۔ جب صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا گیا تو ملک کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اُن کے مالکوں کو نقصان پہنچانا مقصود تھا۔ جانتے ہیں کیا ہوا......؟“

معظم نے محسوس کیا کہ عبدالمجید بعض جگہوں پر ہلکے مزاح کو کمرے کی کشیدگی میں گھول رہا تھا۔

”اُن صنعتوں سے ملک کو فائدہ تو نہیں ہوا لیکن اُن محکموں، جن کی تحویل میں وہ تھیں اور

اُنہیں چلانے والے عملے کے وارے نیارے ہو گئے۔ جب یہ صنعتیں واپس مالکوں کو دی گئیں تو بجلی وغیرہ کے بل اور انکم ٹیکس تک ادا نہیں کیے گئے تھے...... یہ تھی سزا صنعت کو قومیانے کی۔“

عبدالمجید نے سگریٹ اِدھر سے اُدھر کیے۔ تھوڑا عرصہ خاموش بیٹھنے کے بعد اچانک کچھ کہے بغیر باہر کے دروازے کے طرف نکل گیا۔

”یہ آدمی چاہتا کیا ہے؟“ معظم کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ زہرہ جبیں کے ساتھ اُسے اپنے وقت میں عبدالمجید کی حصہ داری گراں گزر رہی تھی۔ ”عبدالمجید سیاسی بروکر ہے اُس کے بارے میں چند باتیں مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اور وعدہ خلافی کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ دوسری قابل ذکر بات اُس کی مردم شناسی ہے۔“ زہرہ جبیں اچانک بات ختم کر گئی۔ اُسے خاموش پا کر معظم نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

”یہ آدمی چاہتا کیا ہے۔؟“

زہرہ جبیں نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

VI

''اپنے ملک میں صنعتی پیداوار تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ قومیائے جانے کے خوف سے نکلنے کے بعد صنعت کار مارشل لا سے خائف ہو گیا۔ تیسرے آمر کے زمانے میں ملک کو قرضے پر چلانا گورننس کا حصہ بن گیا۔ جس طرح غریب طالب علموں کو کسی ٹرسٹ سے فیس ملتی ہے ایسے سہ ماہی یا ششماہی قرضوں کی اقساط ملک کو چلانے لگیں۔ 1979ء کے آخری دنوں میں مغربی سرحد کے پڑوسی ملک پر ایک عالمی طاقت نے حملہ کر دیا۔ اس جارحیت کے نتیجے میں ہمارا ملک پیچھے کی کسی نہایت غیر اہم قطار سے نکل کر صفِ اوّل کے ملکوں میں آ گیا۔ امریکہ نے ہماری معیشت کے مردہ جسم میں نئی زندگی پھونکنے کا وعدہ کیا۔ امریکہ سے ملنے والی امداد کئی Headings کے تحت آتی...... اقوام متحدہ نے مہاجرین کے لیے دفاتر قائم کر کے عملہ تعینات کیا۔ کئی بین الاقوامی تنظیمیں بھی اس کارِ خیر میں کود پڑیں۔ نتیجتاً ملک میں ہر طرف سے اسلحہ اور مالی امداد پہنچنا شروع ہو گئی۔ امداد کو تقسیم کرنے کے ذمے دار افراد دولت سمیٹتے رہے۔ جتنا جہاں جانا چاہیے تھا اُس سے بہت کم وہاں پہنچا۔ پڑوسی کے بحران کو قومی ذریعہ بنانے کے بجائے انفرادی فائدے حاصل کیے گئے۔ عالمی طاقت کے انخلا کے بعد جب ہم نے تجزیہ کیا تو ملک کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی..... سویلین اور فوجی بیوروکریٹوں نے مل کے ملک کو ایک بار پھر ترقی کی پٹری سے نیچے اُتار دیا۔''

عبدالمجید نے سگریٹ بجھا کے سلگایا۔

''سیاسی حکومتوں پر بے شمار دباؤ تھے۔ یہ ایک کھلا راز ہے کہ کوئی فیصلہ فوج کی رضامندی

کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ وزیراعظم جب بھی جی ایچ کیو گیا اُسے برآمدے میں خوش آمدید کہا گیا تاکہ بغیر ٹوپی پہنے ملا جا سکے۔ ٹوپی پہن کے سیلوٹ کرنا ہوتا ہے۔ بجٹ کا بہت بڑا حصہ آج بھی دفاعی اخراجات کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔ یہ غیر سرکاری ایلوکیشن کے علاوہ ہے۔''

عبدالمجید خاموش ہو گیا۔

''میں نے اُس روز بھی جاننا چاہا تھا کہ یہ تمام حقائق بتا کر آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔'' معظم نے برہمی سے پوچھا۔

''میں نے اُس دن بھی کہا تھا کہ آپ سنتے جائیں۔ دو نشستوں کے بعد ہر چیز آپ پر واضح ہو جائے گی۔'' عبدالمجید نے تحمل سے جواب دیا۔

''آپ نے دیکھا کہ آج تک ہم صنعتی سطح پہ کتنی ترقی کر گئے ہیں۔ زراعت میں بھی ایسے ہی ہے۔ ماسوائے خود کفالت کے چند سالوں کے زرعی میدان میں ہم چکروں میں اُلجھے رہے۔ ہمیشہ غلط اعداد و شمار دے کر قوم کو گمراہ کیا گیا اور بعد میں گندم درآمد کی گئی۔ ایسی ہی بدانتظامی چینی کے سلسلے میں رہی۔ زرعی میدان میں ہم صارف اور کسان کے درمیان خرید و فروخت کا توازن قائم نہیں کر سکے۔ دونوں طبقات غیر مطمئن ہیں۔''

عبدالمجید نے سگریٹ تبدیل کیے۔

''اب ہم سیاست اور گورننس پہ آتے ہیں۔''

عبدالمجید کچھ دیر کھانستا رہا۔ کھانسی بند ہونے کے بعد اُس نے سانس کے معمول پہ آنے کا انتظار کیا۔

''برصغیر کی تقسیم کے وقت قائداعظم کے علاوہ تمام سیاستدان نو آموز یا نووارد تھے۔ ہمارے حصے آنے والی بیوروکریسی راج کی تربیت یافتہ تھی اور یہی حال افواج کا تھا۔ سیاست دان شاید ملک میں کسی قسم کا نظام ترتیب دینا چاہتے تھے لیکن بیوروکریسی نے راہ میں روڑے اٹکائے۔ ملک میں دو ایسے قوانین لاگو کیے گئے جن کا کوئی منطقی یا سیاسی جواز نہیں تھا سوائے وقتی فائدے کے۔ گو بیوروکریسی کا کام عملدرآمد کروانا بھی ہے لیکن ہر غلط اور نقصان دہ تجویز کو قانونی شکل میں

آنے سے روکنا بھی ہے۔ ایک ایسا قانون بنایا گیا جس کی رو سے ’’ایک فرد ایک ووٹ کا‘‘ حق جاتا رہا۔ صوبوں کی اسمبلی میں برابر کی نمائندگی کر دی گئی اور پھر بعد میں ون یونٹ کا قیام بھی اِسی طرح کی ناانصافی تھی۔ وسائل کی تقسیم غیر متوازی ہوگئی...... آج اگر آپ دیکھیں تو سب سے زیادہ حصہ پنجاب کو جاتا ہے کیوں کہ آبادی میں دوسرے صوبے کم ہیں۔ یہاں بیوروکریسی نے ون یونٹ کے گن گائے۔ بنیادی جمہوریت کے نظام کو پارلیمانی نظام پر ترجیح دی گئی۔ یہ اس لیے نہیں تھا کہ وہ ایک بہتر نظام تھا، صرف ایک حکومت کو مستحکم کرنا مقصود تھا۔ یکے بعد دیگرے فوجی حکومتوں کے ادوار میں جنگیں لڑی گئیں۔ جنگ ایک بہت مہنگا شوق ہے جسے وہی ملک اپناتے ہیں جو اس کے اخراجات برداشت کرنے کے اہل ہوں۔ پہلی جنگ تو خیریت سے گزری مگر دوسری میں ملک ٹوٹ گیا۔ کیا شکست وریخت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے؟‘‘

عبدالمجید کے سگریٹ بجھ کے جلے۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔‘‘

’’عبدالمجید صاحب! یہ سلسلہ آخر کب ختم ہوگا‘‘ زہرہ جبیں نے سوال کیا۔

’’بیوروکریسی دو متوازی سمتوں پہ چل نکلی۔ کیوں کہ ان کے ساتھ اَب فوج بھی شامل تھی۔ 1977ء کے انتخابات میں حکومت کو چیدہ چیدہ نشستوں پر دھاندلی کی تجویز دے کے اس پر عمل درآمد کیا۔ بعد کے عوامی ردِعمل کے بعد نہ صرف حکومت چلتی کی بلکہ پھانسی سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔‘‘

عبدالمجید نے زہرہ جبیں کی طرف دیکھا مگر اُس کا سوال نظر انداز کر دیا۔

’’فوج نے ہمیشہ سیاسی دفاع کے لیے مقامی حکومت کو بڑی دفاعی پوزیشن سمجھا۔ یہیں سے اُنہوں نے آخری جنگ لڑ کے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا تھا۔ جیسا میں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ بیوروکریسی کا سب سے کارآمد ہتھیار جوڑ توڑ ہے۔ یہ Survival میں یقین رکھتی ہے۔ انہوں نے ہر دور میں آگے کے پائدان تک پہنچنا ہے۔ چناں چہ ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب ان کی وفاداری اپنے ذاتی ارتقا کے علاوہ کہیں نہیں ہوتی۔ اپنے مفاد کے تحفظ میں یہ ہر نظریہ قربان کر سکتے ہیں۔

جہاں حکومتوں کو کامیاب کرانا ان کے فرائض میں ہے وہاں اُن کی ناکامی ان کے مفاد میں۔‘‘

’’عبدالمجید صاحب! میں کئی دفعہ پوچھ چکا ہوں کہ یہ لمبے لیکچر آپ کیوں پلا رہے ہیں۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔‘‘

معظم نے تقریباً چیخنا شروع کر دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عبدالمجید صرف اُس کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔

’’آپ غالباً اُکتا گئے ہیں...... میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔‘‘

عبدالمجید نے اُسی طرح بیٹھے، جواب دیا۔

معظم اُسے بازو سے پکڑ کر باہر نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بار بار عبدالمجید کے صوفے اور باہر کے دروازے کے درمیان فاصلہ ناپ رہی تھیں۔

عبدالمجید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

’’میں فوری وجہ کی طرف آتا ہوں‘‘

اُس کی آواز پرانی رفتار اور لے پر آ گئی۔

’’کچھ عرصہ پہلے ایک پڑوسی سربراہِ حکومت ہمارے ہاں آیا تھا۔ آپ کو یاد ہے؟‘‘

معظم نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’میں آپ کا جواب سن نہیں سکا۔‘‘

عبدالمجید کے لہجے میں شرارت تھی۔

’’جی‘‘

معظم اعتدال پر اُتر آیا۔

’’اُس کی آمد کی تقریبات، سرکاری کھانے والی شام اور رات کو لوگوں کا ردِعمل یاد ہے؟‘‘

’’اُس رات ہم اُسی شہر میں تھے۔‘‘

معظم اور زہرہ جبیں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُن کے ہونٹ ساکت رہے۔

’’لوگوں کا ردِعمل حکومت کی توقعات کے برخلاف تھا؟‘‘

''کچھ ایسے ہی تھا۔''

''لوگوں نے حکومت کے نظریے کو رد کر دیا تھا؟''

''ایسے ہی محسوس ہوا۔''

''کیوں؟''

پیشتر اس کے کہ معظم جواب دے، عبدالمجید نے بولنا شروع کر دیا۔

''ٹیلی ویژن اور ذرائع ابلاغ نے بظاہر دونوں ملکوں کے درمیان ثقافتی پل تعمیر کر دیا تھا۔ حقیقت میں لوگ اپنے اندر نفرت کے ایک مخصوص سوتے کو مستقل طور پر بند نہ کر سکے۔ اُس رات وہ سوتا اُبل پڑا۔ واضح تھا کہ لوگوں کے لیے یہ میٹھی کے بجائے کڑوی گولی تھی۔ انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار گولی تھوک کر کیا۔''

عبدالمجید کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

ان چند دنوں میں پہلی مرتبہ معظم نے دلچسپی ظاہر کی۔

''وہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔'' اُس نے اپنی رائے دی۔

''ہوں...... اِس فیصلے کے مضمرات کو گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی گئی یا ان تک رسائی نہ ہو سکی۔ ملک کے تمام طبقات دو حصوں میں بٹ گئے۔ یہ کل ہی کی بات ہے۔ آپ بھی اس واقع کے گواہ ہیں۔ اس تقسیم کے نتیجے میں جانتے ہیں کیا ہوا''

معظم کہنیاں گھٹنوں پہ رکھ کے آگے جھکا ہوا تھا۔

''آپ کہتے جائیے۔''

''ایک متنازع علاقے میں محدود جنگ ہوئی جس کے نتائج کو مفاداتی رنگ دیے گئے۔ طبقوں کے درمیان اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ ان میں اَب روزانہ اضافہ ہو رہا ہے۔''

عبدالمجید سگریٹ بجھا کے اچانک کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک نظر ڈبیوں پر ڈالی۔

''پرسوں ایک تجزیہ نگار میرے ساتھ ہو گا۔ ہم آپ کو موجودہ حالات کے مستقبل میں متوقع رخ سے واقفیت دلا کر چند تجاویز پر بحث کریں گے۔''

معظم اور زہرہ جبیں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

''بعض اوقات عبدالمجید کی باتیں مبہم سی ہو جاتی ہیں۔''

''آپ دیکھیں کہ وہ کئی معاملات کو ایک مقام پر لانے کی کوشش میں ہے۔ آپ نے کبھی ان پہ غور کیا؟''

''یہ میرا میدانِ عمل نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک پڑھے لکھے اور بالغ نظر آدمی ہوتے ہوئے آپ کا فرض ہے کہ یہ چیزیں آپ جانیں۔'' زہرہ جبیں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''پرسوں دیکھیں گے۔''

VII

معظم، عبدالمجید کی باتوں کو سنجیدگی سے تو نہیں لیتا تھا لیکن کاروباری معاملات میں مصروفیت کے باوجود وہ اس کے ذہن میں ضرور آتیں۔ اس کے ساتھ ہی خدشات کا ایک سلسلہ اس کے گرد جالا بننا شروع کر دیتا۔ وہ محسوس کرتا کہ ملک نے سب کو بہت کچھ دیا ہے لیکن جب وصول کیے میں سے کچھ لوٹانے کا وقت آئے تو پہلوتہی کی جاتی ہے۔ وہ سوچتا کہ کیا اُسے واپس دینے کا آغاز کرنا چاہیے۔ لیکن وہ کہاں سے شروع کرے؟ ایسا نہ ہو کہ وہ سو برس پیچھے جا کر اپنے جد کی طرح ہو جائے؟ جو آج اُس کے پاس تھا اُسے وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس برتری کے نشے کو قائم رکھنے میں لطف ہے۔ یہ سب حقیقت ہے لیکن کیا اس سے لپٹے رہنا خودفریبی نہیں۔ اُسے اپنی کاروباری کامیابی ایک سلطنت کا عکس لگی جس کو قائم رکھنے میں کئی ایسے اقدام کرنا پڑتے ہیں جو ملک کے مفاد کے منافی ہوں۔ معظم کو اچانک ملک اپنی ماں کی طرح نظر آتا، بے بس، مظلوم مگر ہر وقت محبت کا دامن پھیلائے ہوئے۔

اُسے خیال آیا کہ جونہی ایک منفی رویے کا احساس ہو وہیں سے اُس کی تلافی شروع ہو جاتی ہے۔ معظم نے انکم ٹیکس، بجلی، گیس اور چند دوسرے واجبات کی ادائیگی میں سرکاری اہلکاروں کی اعانت سے حکومت کو ایک کثیر رقم سے محروم رکھا ہوا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ پہلے قدم کے طور پر وہ پچھلے دس سالوں کا اپنا کھاتہ ازسرنو تیار کروائے گا۔ واجب الادا رقم کا تعین کرنے کے بعد فیصلہ کرے گا کہ اس رقم کو کس مصرف میں لائے۔

اُس نے اچانک خود کو ہلکا محسوس کیا۔ اُس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ عبدالمجید کو اپنے اس ارادے سے آگاہ نہیں کرے گا۔ معظم کو معلوم ہو چکا تھا کہ عبدالمجید ایک بلیک میلر بھی ہے……

وہ جب زہرہ جبیں کے گھر پہنچا تو عبدالمجید وہاں موجود تھا۔ سگریٹوں کی ڈبیاں اسی طرح پاس رکھی تھیں۔ وہ انگلیوں اور ہونٹوں میں سگریٹ دبائے تھا۔ اس کے ساتھ آنے والا آدمی اُس کے برعکس نہایت دبلا پتلا تھا۔ وہ سگریٹ کے بجائے چائے کی چسکیاں لیے جا رہا تھا۔ عبدالمجید نے اس کا نام غفور احمد بتایا۔ عبدالمجید نے غفور احمد کو بہت بڑا تجزیہ نگار بتایا تھا مگر معظم اُس کے نام سے لاعلم تھا مگر اُس نے رویے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا۔

زہرہ جبیں ٹرالی میں تھرموس میں اُبلتا ہوا پانی، ٹی بیگ والا پیکٹ اور خشک دودھ لے آئی۔

اُس نے ٹرالی غفور احمد کے سامنے رکھ دی۔

”غفور! حالیہ محدود جنگ کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔“ عبدالمجید نے تمہید کے بغیر گفتگو کا سلسلہ پچھلی ملاقات سے جوڑا۔

”ہم لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس نئی صورتِ حال کو ایک سیاسی الجھاؤ نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ دراڑ اُس وقت تک بڑھتی چلی جائے گی جب تک ایک کنارے سے دوسرا نظر آنا بند نہ ہو جائے۔ قدرتی سی بات ہے کہ اس دراڑ پر پل تعمیر ہو گا یا ایسی تحریک سر اُٹھائے گی جس کے نتیجے میں انسانی لاشیں پل کا کام دیں۔“

معظم کو جھرجھری آئی۔

”یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ موجودہ حکومت اب مہمان ہے……“

”کتنے دنوں کی……“ معظم نے جاننا چاہا۔

”کوئی نقشۂ اوقات نہیں دیا جا سکتا۔ میں اپنے نظریے کی گواہی میں تاریخ سامنے رکھوں گا۔ کوئی بھی حکومت اپنی معیاد پوری نہیں کر سکی۔ ہر ایک کا اخراج ان دیکھی قوتوں سے ٹکرانے کی وجہ سے ہوا۔ اس دفعہ بھی دوسری قوت اپنے تمام تر وجود کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے یہ عمل ہو کر رہنا ہے۔“

غفور نے چائے کی نئی پیالی بنائی۔ زہرہ جبیں نے صاف پیالی لا کر ٹرالی پر رکھ دی۔

عبدالمجید اپنے انداز میں سگریٹوں کا دھواں بکھیرتا رہا۔

’’جب یہ حکومت ہٹی تو آپ کے اندازے کے مطابق کیا ہو گا۔‘‘ معظم نے پوچھا۔

’’یہ ایک نصابی سوال ہے...... وہی جو ہوا کرتا ہے...... آئین معطل ہو جائے گا اور مناسب وقت پہ انتخابات کرانے کا وعدہ۔ اُس کے جلد بعد مقامی حکومتوں کے انتخابات عمل میں لائے جائیں گے۔ بظاہر یہ تاثر دیا جائے گا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی ضرورت نہیں۔ اس تمام عرصے میں، جب مقامی حکومتیں وجود میں آ چکی ہوں گی، سیاست دان اپنی اہمیت کی طاقت کا اندازہ لگانے میں مصروفِ عمل ہوں گے۔ ان کی باہمی ملاقاتیں شروع ہو جائیں گی اور اہم ادارے اپنے مخبر اور ہم خیال لوگ ڈھونڈنا شروع کریں گے۔ چار کونوں والے پہیے کے حرکت میں آنے کو سیاسی عمل کا نام دیا جائے گا۔ یہاں چند لوگوں کے علاوہ باقی کی وفاداریاں مشکوک ہوں گی۔‘‘

’’یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟‘‘ اس دفعہ زہرہ جبین نے مخالفت کی۔

’’مرزا جان! یہ دن کی روشنی کی طرح ہے۔‘‘

پھر کوئی تیز دھات معظم کے آر پار ہو گئی۔ غفور بھی پہلی دفعہ آیا لگا تھا۔ معظم نے سوچا کہ جو اُس نے کیا، کیا وہ اُسے کرنا چاہیے تھا؟

’’تمہیں پیچھے دیکھنا پڑے گا۔ خاکہ بالکل ویسا ہی ہو گا، صرف رنگ مختلف ہوں گے۔ اداروں کو جلا بخشنے کے نام پہ ان کا ارتقا رک جائے گا۔ تیسرے آمر نے سیاسی جماعتوں کو الیکشن سے باہر کر کے ایک الگ طریقہ کار متعارف کرایا۔ حکومت بظاہر سیاست دانوں کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ سیاست دان نہیں تھے۔ اصل میں وہ سیاستدان ہی تھے صرف بادشاہ کا گروہ اُن کا آشیانہ تھا۔‘‘

عبدالمجید نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیا۔

’’گروہ کی شکل ہو یا انفرادی صورت میں، ہم ہر طرح کی سیاست سازی کے خلاف ہیں۔‘‘

’’وہ بعد کی بات ہے...... ابھی عمل درآمد کا وقت نہیں آیا۔ ہم نے معاملات کو صحیح تناظر میں لانا ہے باقی بعد میں۔ شاید یہ ہماری زندگیوں میں نہ ہو۔‘‘

غفور نے عبدالمجید کو ٹوک دیا۔

’’کچھ دن پہلے عبدالمجید صاحب نے پؤل کی بات کی تھی۔‘‘

معظم نے اپنے شکوک دور کرنے کا فیصلہ کیا۔

’’ہاں...... وہی تمام برائیوں کا حل ہے۔‘‘

’’لیکن وہ طریقِ کار جمہوریت کے منافی ہے۔‘‘

’’قطعاً نہیں۔‘‘ غفور کے لہجے میں قطعیت تھی۔

’’صرف چند لوگ ملک چلائیں گے۔ انہیں عوام نے منتخب نہیں کیا۔‘‘ معظم نے احتجاجاً کہا۔

’’عوام کا دخل ہو گا۔‘‘ غفور اپنے جواب میں ایک احتیاط رکھے ہوئے تھا۔

’’کیسے۔؟‘‘

’’آپ کے خیال میں کیسے ہو گا؟‘‘

’’مجھے اس نظریے کی Implementation کے طریق کار کا علم نہیں۔‘‘

’’پؤل میں کتنے لوگ ہوں گے؟‘‘ معظم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا۔

’’عبدالمجید صاحب نے واضح نہیں کیا تھا۔؟‘‘

’’آپ نے جاننا نہیں چاہا تھا۔‘‘ عبدالمجید نے دخل اندازی کرتے ہوئے معظم کو جواب دیا۔

’’میری دلچسپی صرف سننے تک تھی۔‘‘ معظم نے اعتراف کیا۔

’’اسی لیے کہا کرتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ ساتھ رکھا کرو۔‘‘ غفور نے قہقہہ لگاتے ہوئے عبدالمجید کو مخاطب کیا۔

’’معظم صاحب۔!‘‘ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ’’چاروں صوبوں اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس پؤل کا تعین کریں گے۔ پؤل میں دو افراد ملک کی سربراہی کے لیے نامزد کیے جائیں گے۔ ان میں سے ریفرنڈم کے ذریعے ایک چنا جائے گا۔‘‘

"اس طرح کرپشن کا لیول بہت اُونچا جائے گا۔ پؤل میں آنے کے بعد اگلے قدم کے لیے رشوت کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ عدلیہ دوسرے اداروں کی طرح ایسے الزامات سے بری نہیں۔ چیف جسٹس کا عہدہ بھی بکاؤ ہو سکتا ہے۔"

"معظم صاحب! یہ واضح سے خدشات ہیں۔ سب سے پہلے عدلیہ میں متوازی داخلہ بند ہو جائے گا۔ سیشن جج بننے کے بعد وہ ایک خردبینی طریقِ عمل سے گزریں گے۔ ہائی کورٹ میں آنے کے لیے اپنے رکارڈ کے علاوہ انہیں ایک بین الاقوامی معیار کے ٹیسٹ سے گزرنا ہوگا۔ اسی طرح ہائی کورٹ میں بھی معیار کا میزان بہت کڑا ہے۔ یہ ایک رات میں حل ہونے والا مسئلہ نہیں۔ اس نظام کو بلوغت تک پہنچنے میں ایک عرصہ چاہیے۔"

"ایک سیکنڈ!" معظم نے بات کاٹی۔ "تجربات کے سلسلے میں ایک اور تجربہ۔ آپ موجودہ نظام کو Mature ہونے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔"

غفور اونچی آواز میں ہنسا اور عبدالمجید کا صوفہ بھی ہل رہا تھا۔

زہرہ جبیں نے تھرمس میں تازہ گرم پانی لانے کے بعد عبدالمجید کے سگریٹ والی ڈبیاں دیکھیں اور مطمئن ہو کے اپنی جگہ پہ بیٹھ گئی۔

"اس نظام کو چلتے ہوئے چوّن برس ہو گئے ہیں۔ میچورٹی کے لیے اور کتنا عرصہ چاہیے۔"

"یہ برس پورے کب ہوئے۔ ہر دفعہ آگے کی حرکت کو Retard کیا گیا۔" معظم نے دفاع کرتے ہوئے بازو پھیلا کے پورے نظام کو بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کی۔

"یہ نظام کے اپنے اندر کی خرابی ہے کیوں کہ اس میں اپنی ناکامی کو دور کرنے کا کوئی خودکار طریقہ نہیں۔"

"ایسا ذریعہ میچورٹی سے ہی آ سکتا ہے...... پؤل میں کتنے لوگ ہوں گے۔" معظم نے فلسفیانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے سوال پوچھا۔

"تین سے پانچ افراد...... اگلا سوال بہت واضح ہے کہ ان لوگوں کی اہلیت ناپنے کا معیار کیا ہوگا؟" غفور نے چائے کی تازہ پیالی بنائی۔

عبدالمجید کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

معظم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کم سے کم عمر پچپن برس، تعلیمی معیار ایم۔ اے اور تیس سالوں سے زائد انتظامی تجربہ، خالصتاً پاکستانی! اس سے مراد یہ ہے کہ وہ پاکستان میں پیدا ہونے کے علاوہ یہیں کا تعلیم یافتہ بھی ہو۔ انتظامی تجربہ ایک ہی نوعیت کا نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کے خاندان میں کسی قسم کی Abnormality یا دماغی خلل کے بارے میں تفصیلی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ زندگی میں اُس کا رویہ متوازی اور مستقل رہا ہو اور کسی قسم کی اخلاقی کمزوری پاس سے بھی نہ گزرے ہو کیوں کہ یہی ایک خاصیت ہے جو حساس اور نہایت اہم فیصلے کرتے وقت طاقت کی دیوار کا کام دیتی ہیں۔"

"ایسی خصوصیات والے ملک میں کئی لوگ ہیں...... اور یہ شارٹ لسٹ کیسے ہوں گے۔"

"ایسے ادارے قائم کیے جائیں گے جن کی ہر ضلع میں شاخ ہوگی۔ ان کا کام صرف ان خصوصیات والے لوگوں کو ڈھونڈنا ہوگا جو پؤل میں داخلے کے لیے ضروری ہیں۔ فلٹریشن کے عمل میں سے گزرنے کے بعد ان کے نام کمیٹی کے سامنے پیش ہوں گے۔ اور کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ ان تمام کو رد کر دے یا کوئی Observation لگا کے واپس بھیجے...... یہ عمل کئی برس جاری رہے گا۔"

غفور نے چائے کا گھونٹ لیا۔

سربراہِ ملک کا دورانیہ کتنا ہوگا۔"

"پانچ سال۔" عبدالمجید نے آنکھیں بند رکھے جواب دیا۔

"اُس کی کارکردگی غیر تسلی بخش ہو تو......"

"اُسے فوراً دفتر سے ہٹانے کا عمل شروع ہو جائے گا۔ ثبوت اکٹھے کر کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے حوالے ہو جائیں گے۔ سربراہ کو اپنے دفاع کا موقع دینے کے بعد اگر مناسب سمجھا گیا تو مقدمہ عوام کے پاس چلا جائے گا۔ ریفرنڈم کے ذریعے اُس کے مستقبل کا تعین ہوگا۔"

"لیکن آپ اہم نظریے کی نفی کر رہے ہیں۔ یہ غیر سیاسی عمل ہے۔ کیوں کہ اس کے

ذریعے صرف بیوروکریٹ ہی سربراہ ہوں گے...... آپ ایک طرح سے شخصی حکومت کو پروان چڑھا رہے ہیں جو جمہوریت کے بجائے آمریت کے قریب رہے۔‘‘

معظم کو کئی برس پہلے والی تاریخ میں دلچسپی نے گرفت میں لے لیا تھا۔

’’ہمارے ہاں ایک نظام مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ ناکامی کی وجہ وہ سیاستدان ہیں جو یہ طے نہیں کر سکے کہ انہیں کیا عزیز ہے؟ نظام کی کامیابی یا ذاتی وسیاسی مفادات۔ انہوں نے ثانوی حصے کو ترجیح دی۔ نتیجتاً موجودہ بے یقینی اور بچاؤ کی جنگ......‘‘

’’آج لوگوں کا رجحان کس طرف ہے۔‘‘

غفور دوسری بار ہنسا۔

عبدالمجید نے ایک آنکھ تھوڑی سی کھولی اور معظم کو دیکھا۔

’’آج کی نشست میں آپ نے پہلا اہم سوال کیا ہے...... لوگوں کو کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنے زندہ رہنے کے وسائل کو برقرار رکھنے میں اس طرح غرق ہیں کہ اُنہیں گدھے یا گھوڑے سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ وہ نازک وقت ہے جہاں سے ان کی سوچ کسی بھی طرف موڑی جا سکتی ہے۔ وسائل کو مزید محدود کرنے کی کوشش میں تو خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں اور اگر اعتماد میں لے کر بتدریج انہیں حقائق کی روشنی اور نئی منزل کا واضح تصور دیا گیا تو وہ قبول کر لیں گے۔ 1958ء سے لے کر آج تک ملک سیاسی طور پر کنگال ہوتا چلا گیا...... ہمارے تجزیے کے مطابق انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔‘‘

غفور نے گردن صوفے کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لی۔

کمرے میں کافی دیر خاموشی رہی۔

’’آپ کے نزدیک حل کیا ہو سکتا ہے؟‘‘

معظم نے جانتے ہوئے بھی سوال کیا۔

عبدالمجید نے سگریٹ بجھا کے نیا سلگایا۔

’’ہمارے نظریہ کا اطلاق‘‘ غفور نے فوراً جواب دیا۔

’’کیسے؟‘‘

’’بظاہر آسان مگر طویل اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد۔ ہماری تنظیم تمام شہروں میں متحرک ہے۔ پہلے مرحلے میں ہم خیال لوگوں کو شناخت کر کے ساتھ ملانا۔ اُس کے بعد چیدہ چیدہ لوگوں کو مخصوص عہدوں تک پہنچا کے اپنی آواز کو عوامی بنانا ہے۔‘‘

’’کیا یہ ساز باز کے زمرے میں نہیں آئے گا۔؟‘‘

’’آپ کے سوالات Predictable ہوتے ہیں...... ہم نے کسی سے ساز باز نہیں کرنا۔ اگلے عام انتخابات میں ہم اپنے اُمیدوار میدان میں لائیں گے۔ اُس وقت ہماری پارٹی وجود میں نہیں آئی ہو گی۔ ہمارے اُمیدوار آزاد یا دوسری جماعتوں کے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لیں گے۔ یہ ہمارا واحد غیر اخلاقی عمل ہو گا۔ اکثریت اُن اُمیدواروں کی ہو گی جو کامیابی حاصل کریں گے اور ان میں سے کچھ کو ایسی جگہوں تک پہچانا ہے جہاں سے ہمارا نظریہ آگے چل سکے۔‘‘

’’وہ آپ کی سوچ کو آگے کیسے چلائیں گے؟‘‘

’’اس سوچ کو نظریے میں تبدیل کرنے کے لیے ہمیں وقت اور ذرائع کی ضرورت ہے ہمارے منتخب لوگ اہم جگہوں پر پہنچ کے ایک سرگوشی کی مہم چلائیں گے۔ یہ مہم اس طور چلے گی کہ اس کا منبع شناخت نہ کیا جا سکے۔‘‘

’’یہ خوف کیوں؟‘‘

’’اسے خوف نہیں احتیاط کہا جائے‘‘

اگر منبع شناخت ہو گیا؟‘‘

’’میں بار بار کہتا ہوں کہ آپ Predictable ہیں۔ جانے جانے کی صورت میں کیا ہو گا؟ ہم موجودہ نظام کا لبادہ اُتار کر اس کے ریا کے خطوط سامنے کریں گے۔ لوگوں کو ہمارا نظریہ پسند آئے گا کیوں کہ اس میں اتنی پیچیدگیاں نہیں اور یہ فکر ہر قسم کے ذاتی ارتقا کے خلاف اور اجتماعی مفاد کے لیے ہے۔ سب سے مثبت نقطہ سربراہ کا اپنے اعلیٰ عہدے کو برقرار رکھنے کے لیے کسی کی خوشنودی کی ضرورت سے بالا ہونا ہے۔ اُسے عوام نے وہاں پہنچایا اور وہی ہٹائیں گے۔‘‘

”اُس کے معاونین......“

غفور نے اس کی بات کاٹی۔

”معاونین، وزیر یا آپ انہیں کوئی بھی نام دے سکتے ہیں صرف سربراہ کو جواب دہ ہیں۔ وہ پارٹی لائین یا کسی بادشاہ گر کے محتاج نہیں۔ ان کی کارکردگی کا وہ ذمے دار ہے اور کسی بھی معاون کی نااہلی اس کے اپنے اخراج کا باعث بن سکتی ہے۔“

”بیوروکریسی؟“

”کون سی؟ سویلین یا فوجی؟“

معظم نے غفور کے چائے کی تازہ پیالی بنانے کا انتظار کیا۔

”دونوں۔“

”سویلین بیوروکریسی صرف عمل درآمد کے لیے ہوگی اور وہ کسی طور مشاورتی عمل میں نہیں لائے جائیں گے۔ ہر وزارت یا محکمے کا اپنا تھنک ٹینک ہوگا جو مختصر اور طویل مدت کی پالیسیاں بناتا رہے گا جنہیں مختلف Panels کے سامنے تجزیوں کے لیے پیش کیا جائے گا۔ موجود نظام کے برعکس کوئی پالیسی جلد بازی کا نتیجہ یا شکار نہیں ہوگی۔ سیاست دانوں کی مجبوری ہے کہ اُنہوں نے فوری مثبت نتائج ظاہر کرنے ہوتے ہیں۔ یہ جماعتوں کی حکومتیں کم اور نمائشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح فوجی بیوروکریسی بھی الگ کر دی جائے گی۔ وہ اپنے کیمپوں تک محدود ہوں گے۔ چھاؤنیاں بڑے بڑے شہروں سے دور یا اُن کی ذمے داری کے علاقوں کے نزدیک ہوں گی۔ وہ کسی آفت یا دوسری مشکل میں حکومت کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے۔ اُن کا کام صرف پیشہ وارانہ مہارت کو انتہا تک پہنچانا ہوگا اور کسی معمولی ناکامی پر بھی جذبات کی رو میں بہہ کر معاف نہیں کیا جائے گا...... ناکامی کا الزام سربراہ مملکت کے سر بھی اتنا ہی آئے گا......“

”میں عبدالمجید صاحب سے کئی مرتبہ پوچھ چکا ہوں، آج آپ سے بھی ملاقات ہوئی...... آپ کے نظریات آپ کے اپنے ہیں۔ میرا دائرۂ دلچسپی مختلف ہے گو ایک مختصر عرصے کے لیے میں سیاست دانوں سے ملا ضرور...... یہ سب کچھ مجھے کیوں بتایا گیا؟“

معظم نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

”میں جواب دیتا ہوں۔“

عبدالمجید نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

”پچھلے چند دنوں کی گفتگو کا مقصد صرف آپ کو ہم خیال بنانا ہے۔“

”میں اختلاف کا حق رکھتا ہوں۔“ معظم نے کرختگی سے کہا۔

”اختلاف رائے متفق ہونے کی طرف پہلا قدم ہے۔“

غفور نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”اُس کے بعد کیا ہوگا؟“

معظم نے ملاقات ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

”آپ مستقبل قریب یا بعید میں ہونے والے انتخابات میں قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لیے ہمارے اُمیدوار ہوں گے۔“

عبدالمجید کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

”اگر میں نکار کر دوں تو......“

”تو اُس صورت میں......“

معظم کو ساتھ والے صوفے کی ہچکی نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ عبدالمجید کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور اُن میں پہلی ملاقات والی لاتعلقی کی برہنہ تلوار لٹک رہی تھی۔ معظم ذہنی اور جسمانی طور پر نڈر آدمی تھا مگر عبدالمجید کی نظر اسے گھائل کر گئی۔ اُس نے خود کو کھوپڑی سے دھڑ کے نیچے والے حصے تک دونیم ہوتے محسوس کیا۔ عبدالمجید آگے کو جھک کر بیٹھا تو معظم نے اگلا وار بچانے کے لیے صوفے پر ٹیک لگا لی۔

”تو اس صورت میں مرزا جان......“

عبدالمجید اپنی دھمکی مکمل کیے بغیر کمرے سے نکلا تو غفور اس کے پیچھے تھا۔

معظم، زہرہ جبیں کے کندھے پر ہاتھ رکھے کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ وہ عبدالمجید کی

نامکمل دھمکی کو کمرے کی چپ میں مکمل ہوتے محسوس کرتا رہا۔

’’یہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔‘‘

’’آپ میری فکر نہ کریں۔ میں خود کو سنبھال سکتی ہوں...... ہمارے پاس دو آپشن ہیں۔ اگر ہم ان کی تجویز رد کر دیں تو یہ لوگ آپ کی ذات کے بجائے کاروبار کو نقصان پہنچائیں گے۔ یونین، انکم ٹیکس، پیداواری اشیاء کا معیار اور ایسی کئی دیگر مشکلات راہ میں حائل ہوں گی۔ ان سے اتفاق کرنے کی صورت میں یہ سب نہیں ہوگا بلکہ آپ کی کاروباری ساکھ اور صنعتوں سے متعلق تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔ یہی نہیں آپ اپنے گروپ کو مزید وسعت دے سکیں گے...... میرا مشورہ ہے کہ ان کی بات مان لینی چاہیے۔‘‘

معظم، زہرہ جبیں کو دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ سامنے نظریں کیے ساکت بیٹھی تھی۔ ایک طرف سے اس کا چہرہ تیسری رات کے چاند کی طرح نامکمل تھا۔ وہ اس حالت میں اسے بہت غیر محفوظ لگی۔ معظم کو اس کے نیم وا ہونٹوں سے خوف ٹپکتا محسوس ہوا۔ اس نے زہرہ جبیں کو بھینچ لیا۔

’’میرے خیال میں ہمیں ان کی تجویز مان لینا چاہیے۔‘‘

معظم کے لہجے میں لاچاری تھی۔

زہرہ جبیں نے اپنا سر اس کے کندھے پہ رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔

VIII

وہ چاروں اسی کمرے میں بیٹھے تھے۔ غفور کے سامنے رکھی ٹرالی میں چائے بنانے کا سامان موجود تھا۔ باقی تین کو پرانی جگہوں پر بیٹھے دیکھ کر معظم کو محسوس ہوا کہ پچھلی نشست ابھی تک جاری ہے۔

زہرہ جبیں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

غفور نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

’’معظم صاحب ایک آدھ وضاحت چاہتے ہیں جسے وہ خود آپ کے سامنے رکھیں گے۔‘‘

زہرہ جبیں نے چابک دستی سے کمرے میں موجود کھنچاؤ کو گفتگو کے وزن تلے دبا دیا۔

’’سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ کے تحت نہیں کیا۔ تفصیلی تبادلۂ خیال کرنے کے بعد زہرہ جبیں اور میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آپ کی تجویز قبول کر لی جائے۔ اس قبولیت میں میرا ذاتی مفاد بھی ہے۔‘‘

معظم اپنے لہجے میں اعتماد محسوس کر سکتا تھا۔

’’چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی صدارت کے انتخاب کا فیصلہ کرتے وقت میری شرط تھی کہ میں نے بلامقابلہ منتخب ہونا ہے۔‘‘ معظم نے گفتگو کو مقصد کی طرف موڑا۔

’’آپ کو صدارت کے لیے آگے لانے کی تجویز ہمارے ایما پر کی گئی تھی۔‘‘

معظم اس انکشاف سے سکتے میں آ گیا۔

’’آپ کو دارالحکومت کی مختلف تقریبات میں مدعو کروانا بھی ہمارے منصوبے کا حصہ تھا۔‘‘

معظم نے خود کو بہت کمزور اور بے بس محسوس کیا۔ اُسے اپنا غرور اور اعتماد ان دونوں کے رحم وکرم پر نظر آیا۔ اُس نے زندگی بھر کامیابیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کی تھیں اور خود اعتمادی ہمیشہ اسے آگے بڑھنے کے لیے اکساتی رہی تھی لیکن یہ یقین آج دھوکہ دے گیا۔ اُس نے ہتھیار ڈالنے میں ہی اپنی نجات جانی۔

''آپ اپنی تجویز بیان کیجئے۔''

معظم نے لہجے کی کرختگی سے اپنی شکست کو چھپانا چاہا۔

''بہت آسان سی بات ہے۔''

عبدالمجید نے سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

''ہم آپ کو الیکشن میں کامیاب کرائیں گے۔''

غفور نے بات آگے بڑھائی۔

''پھر؟''

''یہ ایک طویل سلسلے کا آغاز ہے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد آپ کو پوُل میں شامل کیا جائے گا۔ وہاں مدِ مقابل کو شکست دینا یا خود ہار جانا آپ کی ذاتی اہلیت پر منحصر ہے۔''

معظم کو اختتام کی صداقت پر شک ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی کی ہر آزمائش کڑی ہوتی ہے اور شارٹ کٹ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

''اس کی قیمت کیا ہوگی؟''

یہ سوال کر کے وہ گھبرا گیا۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس جھوٹ کو سچ کرنے کے لیے اُسے زہرہ جبیں سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں۔؟

معظم نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔

''کوئی اتنی مشکل نہیں۔''

غفور نے بات کو آسان بنانے کی کوشش کی۔

معظم خاموش بیٹھا رہا۔

''صرف ڈیڑھ۔''

غفور نے لاتعلقی سے کہا۔

''ڈیڑھ کیا؟''

معظم نے دلچسپی اور تجسس سے پوچھا۔

''کروڑ۔''

اُس نے زہرہ جبین کی طرف دیکھا۔ یہ نظر درزیدہ نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ اس کی خاموش یا ظاہری رضامندی چاہتا تھا۔

زہرہ جبیں مجسم بنی اُسے دیکھتی تو رہی مگر آنکھوں میں اثبات کی مہر تھی۔

''ٹھیک...... ادائیگی کا شیڈول اور بعد کا Modes Oprendai......

''یعنی طریقۂ کار۔''

غفور نے لقمہ دیا۔

''درست!''

''آدھا الیکشن سے پہلے اور بقایا جیتنے کے بعد۔''

''اگر الیکشن نہ ہوئے......''

''ہم انتظار کریں گے۔ ایک ناکام نظام کو کامیاب بنانے کی کمزور کوششیں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ الیکشن زیادہ دور کی بات نہیں۔''

''میری بھی ایک شرط ہے۔''

عبدالمجید نے سگریٹ بدلتے ہوئے سوالیہ انداز میں سر ہلایا۔ غفور کی نظریں معظم کے چہرے پر تھیں۔

''میں بلا مقابلہ جیتنا چاہوں گا۔''

عبدالمجید کے صوفے کے سپرنگ چیخ اُٹھے۔

''ہم قومی سطح کی بات کر رہے ہیں۔ یہ ضلعی چیمبر کے صدر کا انتخاب نہیں۔ ایک بالکل نئے اُمیدوار کو جتانا بذاتِ خود بہت بڑا کارنامہ ہے......''

معظم نے بات وہیں ختم کر دینا مناسب سمجھا۔

VIII

’’الیکشن مستقبل قریب میں منعقد ہونے کا امکان نہیں۔ موجودہ قیادت مخفی طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کی کوشش میں مصروف ہے۔ سوچ کی Valadity کے قطع نظر ان کا طریقہ بھونڈا ہے۔ اس وقت دو مخالف طاقتیں ایک پٹری پہ شانہ بشانہ چل رہی ہیں۔ ایک نے دوسری کو پیچھے دھکیلنا ہے اور اس عمل میں وہ کچھ دیر کے لیے اپنا توازن بھی کھوئے گی۔ تب وہ خلا ہے جسے ہم نے اپنی موجودگی سے پُر کرنا ہے۔ آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا ...... لیکن یہ ہونا ضرور ہے۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔‘‘

عبدالمجید اکیلا آیا تھا۔

’’آج کل الیکشن ذات اور برادری کے جھنڈے تلے لڑے جاتے ہیں جب کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔‘‘

معظم نے اپنا خدشہ کھول کے سامنے رکھا۔

’’نہیں ایسا نہیں ..... اکیلا تو آپ کا مدِ مقابل ہے۔ ہم نے آپ کے لیے نیم دیہاتی اور نیم شہری حلقے کا انتخاب کیا ہے۔ آپ کا مخالف اس حلقے سے پچھلے چار الیکشن جیت چکا ہے۔ ہر دفعہ اُس نے جماعت بدل کر بادشاہ کی پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ اب بھی یہی توقع ہے۔ وہ ایک فیوڈل ہے اور اس کے نعرے ختم ہو چکے ہیں۔ وہ ہر مسئلے کو اپنی مخصوص سوچ کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ آپ تین فیکٹریوں کے مالک ہیں جفت سازی، ٹیکسٹائل، لوہا اور یہ تین ذاتیں، برادریاں آپ Exploit کریں گے۔ زمینی کام ہم نے کرنا ہے۔‘‘

’’بظاہر یہ ایک آسان عمل ہے لیکن حقیقت میں کیا ممکن ہو گا۔‘‘

’’آپ صحیح خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں...... آپ نے ثابت قدم رہتے ہوئے ہماری ہدایات پایۂ تکمیل تک پہنچائی ہیں۔ ہم جلد آپ کی تربیت کا آغاز کرنے والے ہیں۔ جدید سیاست دان اداکار ہوتا ہے۔ اُسے پریس اور ٹی وی وغیرہ کو مٹھی میں لینے کا ہنر آنا چاہیے۔ آپ کے اُردو اور انگریزی کے قدرے پھیکے لہجے کو دلکش بناتے ہوئے لباس میں بھی روایت اور جدت کا رنگ بھرنا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر متعدد ترکیبیں سکھانا ہے۔‘‘

معظم دل کھول کر ہنسا۔

’’اب بھلا ان چیزوں کی عمر ہے؟‘‘

’’سیاست دان کو ہمیشہ تربیت کی ضرورت رہتی ہے اور ہماری نظر تو بہت دور اُٹھی ہے...... آپ کو پول میں لانا ہے۔‘‘

پہلی دفعہ کمرے کے ماحول میں کھچاؤ نہیں تھا۔

پھر عبدالمجید معمول کی طرح چلا گیا۔

زہرہ جبیں اور معظم گھر میں اکیلے تھے۔ معظم نے بہت دنوں کے بعد زہرہ جبیں کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے تھکی تھکی سی نظر آئی۔ اس کے رنگ میں زردی غالب تھی اور آنکھوں کے نیچے واضح سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ معظم نے یہ ذہنی دباؤ کا اثر جانا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا کہ ایک کڑی آزمائش کا اختتام ہو گیا ہے۔ وہ عبدالمجید کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے بھی زہرہ جبیں کے لیے وقت نکال سکے گا۔ اُن دونوں کی زندگی تعطل کا شکار رہی تھی مگر وہ اسے واپس پرانی ڈگر پر لے آئے گا۔

معظم اکثر سوچتا کہ کیا زہرہ جبیں اب بھی پہلے والی عورت ہے؟ وہ غالباً وہی تھی لیکن اُس نے ویسا نہیں رہنے دیا۔ اُس نے سوچا کہ زہرہ جبیں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی شکل میں ڈھلتی گئی جس میں وہ ڈھالتا گیا۔ وہ بہتے پانی کی طرح تھی جس میں نہانے سے جسم اجلا ہو جاتا

ہے مگر اس سے اُتری کثافت کہیں نظر نہیں آتی۔ پانی اپنے اندر تمام میل اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہاں پاکیزگی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ معظم کو یقین ہوگیا کہ زہرہ جبیں ویسی کی ویسی ہے...... آلودگی تو اس کے اپنے اندر ہے۔

’’عالی مرتبت سربراہِ مملکت!‘‘

زہرہ جبیں کی آواز نے خیالات کے شیشے کو چھن سے توڑ دیا۔

معظم نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ زہرہ جبیں کی آنکھوں میں ایک لمحے میں تکلیف کے سائے کا غیر مرئی وجود لہرا کے کسی گہرائی میں ڈوب گیا ہے۔ اُس نے اس کیفیت کو زہرہ جبیں کے روبرو لانے کا فیصلہ کیا۔

’’تم خیریت سے ہو۔‘‘

’’ہوں...... کیوں؟‘‘

’’مجھے کچھ ایسے ہی محسوس ہوا۔‘‘

’’ایسی بھی کوئی بات نہیں...... ذرا تھک گئی ہوں۔‘‘

’’پچھلے چند دنوں کے تناؤ کا اثر ہوسکتا ہے۔‘‘

زہرہ جبیں کی مسکراہٹ میں بہت نرمی تھی۔

معظم کو اپنی چھاتی کے وسط میں تتلی پھڑ پھڑاتی محسوس ہوئی۔

’’نہیں...... ! آپ جانتے ہیں کہ میں ایسی حالتوں سے نمٹنا جانتی ہوں۔‘‘

اس کی مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔

’’آپ کو اب اپنے معمول میں احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔‘‘

زہرہ جبیں نے آنکھیں جھکاتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔

’’میں عبدالمجید کے اگلے رابطے کا منتظر ہوں اور اسی سے ہدایات لوں گا۔‘‘

معظم نے زہرہ جبیں کا اشارہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

’’آپ نے انتظار کرنا ہے۔ کسی بھی حالت میں ان لوگوں سے رابطہ قائم کرنا ہمارا کام نہیں۔‘‘

معظم نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’ایک اور بات آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔‘‘

معظم کے جسم میں ہلکا سا تناؤ پیدا ہوگیا۔

’’میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے تبدیلی کی ضرورت ہے۔‘‘

زہرہ جبیں کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

’’کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم کچھ دنوں کے لیے کہیں چلتے ہیں...... بیرونِ ملک چلیں! تم کبھی باہر بھی نہیں گئیں۔‘‘

معظم نے اشتیاق سے کہا۔

’’نہیں...... میں اکیلے جانا چاہوں گی۔‘‘

’’کیوں......!!‘‘

’’ایک دفعہ آپ اکیلے اپنی ذات کی کھوج میں نکلے تھے۔ یہ بتایا تو نہیں گیا لیکن بہت واضح تھا۔ واپسی پر آپ کے Behavior میں نمایاں تبدیلی تھی۔ میں بھی اسی طرح جانا چاہتی ہوں...... آپ نے مجھے ڈھونڈھنے کی کوشش نہیں کرنی۔‘‘

معظم کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ زہرہ جبیں اس کے ردِعمل کی منتظر تھی۔

’’واپسی کب تک ہوگی۔‘‘

معظم نے ہتھیار پھینکتے ہوئے لمبی سانس لی۔

’’میں نہیں کہہ سکتی۔ ایک سال بھی لگ سکتا ہے۔‘‘

’’میں انتظار کروں گا۔‘‘

’’مجھے اُمید تھی کہ آپ سمجھ جائیں گے۔‘‘

’’تمہاری مالی پوزیشن کیسی ہے؟‘‘

معظم کو اس کی آخری پائی کا بھی علم تھا۔

’’مناسب۔‘‘

زہرہ جبیں نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی آواز بمشکل معظم تک پہنچی۔

''میرا ایک ایسا ذاتی اکاؤنٹ ہے جس میں غالباً کافی لاکھ روپے دبے ہوئے ہیں۔ میں کار سے ابھی چیک بک لاتا ہوں۔''

معظم جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلا گیا۔

وہ بریف کیس اُٹھائے واپس آیا۔ اُس نے چیک بک نکال کر تمام صفحات پہ دستخط کیے اور زہرہ جبیں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ چیک بک تھامتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں ویرانی کے بادل چھا گئے اور معظم نے محسوس کیا کہ اُن بادلوں میں دو ستارے چمک رہے تھے۔

''اگر کبھی مزید روپوں کی ضرورت پڑی تو فلیٹ میں رات کو فون کر دینا۔ مطلوبہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی اور ہاں! میں صبح ہی CLI ہٹوا دوں گا تاکہ تمہاری کال ٹریس نہ ہو سکے۔ یہ وعدہ ہے۔'' معظم نے ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے زہرہ جبیں نے اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھوں سے لگا لیا۔

حمیدی

فصل سوئم

حمیدی

I

میں صبح سو کر اُٹھا تو پری گھر پر نہیں تھی۔

وہ مجھے آج تک نہیں ملی۔

میں فکر و عمل کی کئی منزلوں سے گزرا۔ مجھے پری کا انتظار تو تھا لیکن میں اس احساس سے کبھی چھٹکارا حاصل نہ کر سکا کہ ہم دوبارہ نہیں ملیں گے۔ اس احساس کی وجہ وہ خوف تھا جو شروع سے ہی ہمارے درمیان میں ہر وقت موجود رہا، کبھی رقیب اور کبھی آسیب کی شکل میں، جس کے خوف نے ہمیں اکٹھے رکھا تھا۔

میں نے پری کا بہت عرصہ تک انتظار کیا۔

مجھے علم تھا کہ یہ انتظار ایک بے سود کوشش ہے لیکن مایوسی کا لفظ میری زندگی کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ بتدریج میری زندگی اپنی سمت کا تعین کرنے لگی۔ پری نے اپنی غیر حاضری کے باوجود میرے ذہن میں موجود رہ کر سوچ کو نئے زاویے دینا شروع کر دیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے زندگی کو اس کی آنکھ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی شناخت برقرار رکھنے کے لیے زندگی کی پرانی ڈگر پر چل پڑا۔ کام، شراب اور عورت کو مجھے اپنے شب و روز میں جبری طور پر لانا پڑا مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔ شراب اور عورت سے اپنے خلا کو بھرتے ہوئے مجھے کسی حد تک بے وفائی کا احساس ہوا۔ یہ احساس اُس پچھتاوے سے بھی شدید تھا جو مجھے فرزندِ قربان کو پری کے پاس چھوڑ آنے پر ہوا تھا۔ یہ دوہری کاٹ والا خنجر تھا۔ میں نے ترقی کی خواہاں عورت کو اُس کے جذبے کی

سعی میں چند بے اُصول غیروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا اور جب وہ میری بہتری کے لیے ایک منصوبہ بنا کر خود کہیں گم ہوگئی تو اُس کو بھلانے کے لیے شراب اور عورت کا سہارا لے کر اُس کی ذات کو مزید محدود کر دیا۔ میرے سوئے ہوئے ضمیر کے جاگنے کی انگڑائی زلزلے سے کم نہ تھی۔ جب میں نے اس واقع کو جذبات سے ماورا کر کے دیکھا تو مجھے اپنے اندر باپ، دادا اور پردادا کا Genetic غلبہ نظر آیا۔

مجھے اپنے حسب نسب پہ شرمندگی ہوئی۔

عملے اور اپنے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ رکھنا میری زندگی کے معمولات میں تھا۔ ایسے رویے میں شعوری کوشش شامل نہیں تھی، اس کی وجہ سطحی سا احساسِ برتری تھا۔ میں تعلیم اور ظاہری قد کاٹھ کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ قبول ہوں۔ اسی جذبے نے مجھے شناساؤں اور ماتحتوں کے ساتھ خیالات کی شراکت سے باز رکھا ہوا تھا۔ پری اور میری سیکرٹری اس سلسلے میں پل کی طرح تھیں۔ پری کے چلے جانے سے میں بالکل تنہا رہ گیا۔ میں اب شفقت سے بھی دور رہنے لگا، یہ نہیں کہ پہلے اُس کے ساتھ میرا رویہ ہم خیالوں والا تھا۔

میں نے اپنی تنظیم میں اپنے لیے منیجر کے بجائے لیڈر ہونا چنا اور تمام عملہ ایک عسکری تنظیم کے ضابطے اور درستگی سے کام کر رہا ہے۔ پری کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان تمام میں Initiotone کی کمی ہے۔ وہ صرف اتنا ہی کام مستعدی سے کرتے ہیں جتنا انہیں بتایا جائے۔ میرا تجزیہ تھا کہ یہ رکاوٹ صرف میرے ایک Demi-god ہونے کی وجہ سے تھی کیوں کہ اگر آپ اپنے طور پر کوئی نیا کام کریں گے تو اس میں غلطی کا احتمال ہوگا جو مجھے ناپسند تھا۔

پری مجھے تو تنہا کر ہی گئی تھی، مجھے اپنے اِردگرد کام کرنے والوں کے اس رویے کا جب احساس ہوا تو خود کو بالکل اکیلا پایا...... میں نے پری کی یاد میں اپنے تمام ملازمین کے ساتھ گھل مل کر اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا... مجھے یقین تھا کہ وہ اسے پسند کرے گی۔

میری فکر نے کئی کروٹیں لیں۔ مجھے ایک کامیاب صنعتی سلسلہ ورثے میں ملا تھا اور میں نے اُسے مزید وسیع کیا۔ میں دولت اور شہرت کی اس بلندی پر تھا جہاں سے ہر چیز چھوٹی اور دور نظر آتی

ہے۔ شان وشوکت کے اس ہنگامے کے ساتھ ساتھ میرے اندر تنہائی کے جنّوں کی بھی ایک بستی تھی۔ میں اس آبادی کے قریب جانے سے خوفزدہ تھا۔ پری کے پاس وہ علم تھا جس کے کمال کی وجہ سے جن اس بستی کو چھوڑ گئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ دوبارہ ڈیرے جمانے لگے۔ مجھے ان جنّوں کو کسی طور بھگا کر اس بستی میں روشنی کرنا تھی۔ میں گھنٹوں اس پر غور کرتا رہتا لیکن کوئی حل نہ نکلا۔ تحلیلِ نفسی کے لیے سپیشلسٹوں کے پاس گیا مگر یہ سعی لاحاصل تھی۔ میں ایک رات کمرے کی بتی بجھا کر بیٹھا تھا۔ شیشے والی کھڑکی کے باہر قمقمے کی روشنی ایک مخصوص علاقے پر پھیلی ہوئی تھی جو ساکت اور بے جان تھی۔ جہاں یہ روشنی دم توڑ رہی تھی وہاں ایک درخت تھا جس کے دوسری طرف اسی طرح کا قمقمہ روشن تھا۔ دونوں دم توڑتی روشنیوں کے درمیان میں درخت کے ہلتے سائے ان میں زندگی پیدا کر دیتے۔ یہ سائے چھوٹے چھوٹے بھنوروں کی شکل میں پھیکی روشنی کو چمک دار بنا دیتے۔ وہ چمک ایک ہی کوندے سے جنّوں اس کی بستی کو روشن کر گئی۔ مجھے قمقمے اپنی زندگی لگے، منور اور ساکن۔ درخت ان دونوں کے درمیان میں شادمانی کی علامت تھا جب کہ دونوں قمقمے شہرت اور دولت کی معراج تھے۔ مجھے درخت میں زندگی نظر آئی اور میں اسی کا متلاشی ہوگیا۔

II

آج مجھے چلنے کے لیے چھڑی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میں کسی جسمانی روگ یا عارضے میں مبتلا نہیں، صرف عمر کے بوجھ نے میری ٹانگوں کے لیے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔

جب شاد مانی کو کھوجنے نکلا تو مجھے اپنے سفر کی سمت کا علم نہیں تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اس تلاش میں کسی طور پر اپنی چھوٹی سی مملکت کو تباہ نہیں ہونے دینا۔ یہ ایک مشکل سفر تھا جو مجھے دائروں میں گھماتا رہا۔ مجھے سامنے موڑ نظر آتا اور پیچھے گرد ہی گرد۔ میں چلتا رہا اور یہ دائرے وسیع ہونے لگے جس کی وجہ سے سفر کی طوالت بڑھتی رہی۔ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میرے سامنے ہمیشہ شاد مانی کا حصول رہا۔ یہ بیکن کی طرح میری سمت صحیح رکھے ہوئے تھی۔ پھر مجھے ایک دن اچانک دو روشن قمقموں کے درمیان درخت نظر آیا۔ میں وہیں رُک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں دھول نہیں تھی اور سامنے دور تک ہموار میدان تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ٹیلے پر چڑھ گیا تاکہ مزید نظارہ کر سکوں۔ جس شاد مانی کا میں متلاشی تھا وہ تو میرے اپنے اندر تھی۔ اُس کا شہرت اور دولت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ دونوں تو کناروں کے اندر سے باہر کی طرف اُچھلتے پانی جیسی تھیں۔ شاد مانی ایک ایسے سکون میں چھپی تھی جو کنوئیں کے پانی کی طرح گہرا ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

میں سفر کی تھکان مٹانے کے لیے اس کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔

جب یہ منکشف ہوا کہ سکون تو میری اپنی ذات کی بکل میں چھپا ہے تو مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ میں واقعی اتنا سطحی تھا کہ اپنے اندر کی گہرائی کو نہ ناپ سکا۔ مجھے یہ احساس یک لخت شانت کر گیا۔ ایسے محسوس ہوا کہ میری تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں ہیں۔ اس شاد مانی نے میری زندگی کے اُفق کے دوسرے کنارے کو بھی روشن کر دیا۔ یہ اُجالا بیچ میں کہیں جھٹ پٹے کی کیفیت دھار لیتا جہاں مجھے کئی سائے نظر آتے۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو مانوس سایوں میں میرے والدین، رخشندہ، پری تھے جب کہ کچھ کو میں پہچان نہ سکا مگر اُن کی شکل وصورت اور باہمی مشابہت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے دادا، دادی اور پردادا، پردادی ہیں۔ تین اجنبی چہرے ایسے تھے جن کو میں نے اندازے سے ہی پہچانا اور یہ تھے وہ میرے پردادا نے جسے انگریز حکام کے حوالے کر کے ہمارے خاندان کی ترقی کی بنیاد رکھی، بنک کے کیشئر اور فورمین جن کی ہڈیوں نے ہماری ترقی کی کھیتی کو جلا بخشی...... یہ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ تمام کچھ واپس مانگ رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ان کا مقروض ہوں اور وقت آ گیا ہے کہ ان قرضوں کا بوجھ اُتار دوں۔

اجتماعی قرضے انفرادی طور پر نہیں اُتارے جاتے۔

عبدالمجید کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ وزیراعظم نے ان تمام طاقتوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا جو ان سے طاقتور تھیں۔ اُنہیں اپنی طاقت کا زعم تھا لیکن دراصل وہ بہت کمزور تھے۔ اُن کے نزدیک ترین رفقا انہیں پسند نہیں کرتے تھے اور زوال کی وجہ بھی بنے۔ عبدالمجید کے تحفظات درست تھے۔ اس نظام کو خود غرضی کی دیمک متواتر کھائے جا رہی تھی۔ مجھے پری کے گھر والی تمام بحثیں یاد آئیں۔ عبدالمجید کے گروپ نے مستقبل کو صحیح تناظر میں دیکھا تھا۔ وزیراعظم کی اقتدار پر گرفت آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ چکنے ہاتھوں سے بھاری سلاخ کو تھامے رکھنا چاہتے ہوں۔ اُن سے ذاتی شناسائی کی وجہ سے میں ٹیلی ویژن پر خبریں ضرور دیکھتا۔

ہمارے ہاں غیر تحریر شدہ ضابطہ ہے کہ خبروں کا اسی فیصد وقت سربراہِ حکومت کے لیے وقف ہوتا ہے جو آج بھی جاری ہے۔ مجھے وزیراعظم پریشان دکھائی دیتے اور بار بار سر کھجانا اس طرف واضح اشارہ تھا۔ میں ان سے دوبارہ نہیں ملا اور نہ ہی انہوں نے پری سے کسی قسم کا رابطہ کیا۔ پری کی ان کے بارے میں رائے ایک غلط ردِعمل بھی ہو سکتی ہے۔

وزیراعظم حکومت سے الگ کر دیئے گئے۔ جس طرح ہوا کرتا ہے، اُن کی ہر پالیسی کو ذاتی

مفاد پر مبنی قرار دیتے ہوئے ملک کے منافی گردانا گیا۔ تمام حکومتی ذرائع ان الزامات کی تشہیر میں مصروف تھے۔ اُن کے بنائے ہوئے صدر نے اپنے لیے ایک مختلف پیچ کی شکل اختیار کر لی اور وہ بھی اُنہیں دشواریوں سے چھٹکارا نہ دلا سکے۔ سیاست سے کنارہ کشی ہی ان کے لیے واحد راہِ فرار تھی جو اُنہوں نے اختیار کر لی۔

تبھی انتخابات کا اعلان کیا گیا۔

عبدالمجید نے مجھے پیغام بھجوا کر ملنا چاہا اور ہم طے شدہ وقت پر ملے۔ وہ کونے میں رکھے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ اُس نے جیب سے سگریٹ نکالے اور نہ ہی مانگے۔

”سگریٹ؟“

کچھ انتظار کے بعد پوچھا۔

”نہیں“

اُس کا قہقہہ بلند تھا۔

”آپ کو حیرت ہوگی کہ میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا ہوں۔“

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور اُس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔

”یہ فیصلہ نبھاتے ہوئے مشکل تو نہیں ہو رہی؟“

”مشکل اور زندہ رہنے کے درمیان جنگ میں سگریٹ نوشی ہار گئی...... آپ کو میں تازہ دم نظر نہیں آ رہا؟“

”کچھ ایسے ہی ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔

اُس نے ایک لمبی سانس لے کر صوفے پر جگہ بدلی۔

”ہم ملاقات کے مقصد کی طرف آتے ہیں“

میں سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مرزا جان کے ہاں ہم نے جو تجزیہ کیا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے درمیان میں یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ الیکشن میں ہماری نمائندگی کریں گے۔“

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔

”کچھ سیاسی جماعتوں کو ملا کے ایک نئی جماعت کو وجود دیا جا رہا ہے جس میں پچھلی حکمران جماعت کا صلح پسند گروپ بھی ہوگا۔ ابھی یہ نظریہ نقطۂ آغاز سے آگے نہیں چلا لیکن انہیں لوگوں نے بظاہر حکومت بنانی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شاہ کے وفادار ہیں کہ انہیں بینگن سے کوئی نسبت نہیں۔ ہم آپ کو چپکے سے ان میں شامل کر رہے ہیں۔“

وہ سانس لینے کو رکا...... اسے شاید سگریٹوں کی طلب ہو رہی تھی۔

”ہم نے ایک وقت میں ایک مسئلے کو حل کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ شروع میں مکمل طور پر بیک گراؤنڈ میں رکھتے ہوئے آپ کو دھوم دھام کے ساتھ میدان میں اُتاریں گے...... لیکن ابھی......“

وہ پھر رُکا۔ آنکھیں بند کیے اس نے باہر دروازے کی طرف دیکھا۔

”آپ کو تربیت دینے کا مرحلہ آ گیا ہے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ جیسا آپ چاہتے ہیں ویسے ہی ہوگا۔“

میرے خیال میں میرا خدشہ درست تھا۔

”یقیناً! آپ کی کامیابی یقینی ہے بشرطیکہ آپ ہماری ہدایات پر عمل پیرا رہیں۔“

میری تربیت کا آغاز ہو گیا۔

مجھے اپنی Sophistication کی وجہ سے کسی حد تک احساسِ برتری تھا۔ دورانِ تربیت میں مجھے محسوس ہوا کہ ابھی میں نے واقعی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

سب سے پہلے لباس کی اہمیت بیان کی گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ شخصیت کا حصہ ہوتا ہے۔ لباس کی سلیقے سے سلائی اور اسی طرح زیبِ تن کرنے سے انسان کی کشش میں اضافہ ہوتا ہے اور رنگوں کا انتخاب سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ مجھے ہر طرح کے لباس پہننے سکھائے گئے، ایسا

نہیں کہ میں نے وہ پہلے کبھی نہیں پہنے تھے۔ مختلف مواقع کے لیے موزوں لباس اور رنگ کا چناؤ ضروری تھا۔ لباسوں کی مناسبت سے چال میں بھی تبدیلی لانا تھی۔ اگر سوٹ پہنا ہوا تھا تو تھوڑا تن کے، ایڑیوں پر وزن ڈال کے، سادہ کوٹ اور پتلون میں آرام سے ہو کے اور شلوار قمیض اور واسکٹ میں بازوں کو ذرا کھول کے چلنا۔ سگریٹ پینے کا انداز لباس پر منحصر تھا۔ سوٹ کے ساتھ سگار یا پائپ پینا تھا جب کہ شلوار قمیص میں سگریٹ۔ المیہ یہ تھا کہ میں تمبا کو نوشی نہیں کرتا۔

انتخاب کی مہم کے دوران میں میں نے ہر شام پریس کانفرنس کرنا تھی۔ ان کانفرنسوں کے لیے مجھے متعدد ریہرسل کرائے گئے۔ یہ کانفرنسیں بے انتہا مصروفیت میں سے وقت نکال کر منعقد ہونا تھیں۔ وقت کی کمی کے باوجود ان کے تاثر کو دیرپا بنانے کے لیے مجھے اپنے حلیے میں بھی کشش رکھنا تھی۔ ان موقعوں پر عموماً مجھے شلوار قمیض پہن کر انگلیوں میں سگار تھامنا تھا۔ میرے لہجے اور تلفظ کو اس طرح پالش کیا گیا کہ دیہاتی اور شہری آبادیوں کے لیے ایک لفظ کے دو رنگ ہوں۔

مجھے ذات پات کے نظام سے اتنی دلچسپی اور واقفیت نہیں تھی۔ اس کے ماخذ سے لے کر اُس وقت تک کی تمام تبدیلیوں کے بارے میں بتایا گیا۔ تمام ذاتوں اور برادریوں کی خصوصیات، طور طریقے اور عادات پر تفصیل بہت دلچسپ تھی۔ میرا مدِ مقابل ایک بڑا زمین دار تھا۔ اس کی پچھلی چار نسلوں سے آگاہی کرائی گئی اور خود اس کے بارے میں اتنی تفصیل سے بتایا گیا کہ یوں محسوس ہوا کہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں تقریر کے فن سے بالکل بے بہرہ تھا۔ مجھے اس کے تمام اُصول وضوابط سکھائے گئے۔ مشقوں کے لیے ایک چھوٹا سا سٹوڈیو بنایا گیا جس کی چاروں دیواروں میں شیشے لگے تھے جہاں میں خود کو ایک وقت میں کئی زاویوں سے دیکھ سکتا تھا۔ وہاں روزانہ دو گھنٹے مجھے تقریر کی مشقیں کرائی جاتیں اور ساتھ ہی چھت میں نصب دو کیمرے فلم بنا رہے ہوتے۔ وہ فلمیں مکمل طور پر مجھے نہیں دکھائی جاتی تھیں۔ صرف معترضہ حصوں پر تجزیاتی تنقید ہوتی۔ میری تقریروں کے موضوعات بہت دلچسپ تھے، کہیں میں غربت کے حق میں بات کر رہا ہوں تو کہیں اسے دور کرنے والے عوامل سامنے لاتا۔ بعض اوقات صنعت کاروں کے خلاف بات کرتے ہوئے زمین داری کے نظام کو

سراہتا اور کبھی اس کے اُلٹ۔ ایسے کئی اور موضاعات تھے لیکن اپنے مخالف کی ذات پر گفتگو خاص کشش لیے ہوتی۔ مجھے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ایسے محسوس ہوتا جیسے کسی دیرینہ ہمدم کے متعلق محوِ کلام ہوں۔

مجھے انتخابی حلقے کے سرکردہ لوگوں سے بھی شناسائی کرائی گئی۔ ان لوگوں کی کوئی سیاسی وابستگیاں نہیں تھیں لیکن یہ مقامی طور پر بادشاہ گر سمجھے جاتے تھے۔ میں مقامی اور ملکی سیاست کے رجحانات سے مکمل طور پر ناآشنا تھا اور میرا تمام تر علم مفروضوں پر مبنی تھا۔ اس طرح کے بادشاہ گروں کے بارے میں سن تو رکھا تھا لیکن مجھے ان کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ یہ شہری علاقوں سے تھے یا دیہاتوں کے، ان کا منتہائے مقصود ایک ہی تھا، یعنی دولت اور شہرت کا حصول، یہ لوگ چاہتے تھے کہ وہ جب بھی آئیں، میں اپنی تمام مصروفیات بالائے طاق رکھ کر ان سے ملوں اور ان کی تمام مانگیں پوری کروں۔ مجھے ہدایات تھیں کہ انتخابات جیتنے سے کسی فرد یا تنظیم کا کوئی کام نہ کروں بلکہ انہیں وعدوں کی بھول بھلیوں میں گم رکھوں۔

مجھے الیکشن کی تیاری اور اس کے Conoduct کے بارے میں کچھ تحفظات تھے مگر تربیت کے مرحلے سے ہی دلچسپی روزانہ بڑھتی گئی۔ زندگی کی ہر منزل میرے لیے ایک چیلنج رہی ہے اور الیکشن بھی میں نے ایسے ہی لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام عمل میرے لیے باعثِ لطف وتسکین تھا۔ اس کی تیاری کے بعد جب مہم کا مرحلہ آیا تو مجھے کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئی۔ اپنے حلقے کی تمام تفصیلات مجھے ازبر تھیں۔ عام آدمی میری سوجھ بوجھ پر حیرت زدہ تھا۔ میرے مخالفین نے مجھے شہری بابو کا نام دیا لیکن میری شبانہ روز محنت اور معاملات سے واقفیت نے انہیں پریشان کر دیا۔ وہ مجھے سرکاری اور کبھی امریکی پٹھو کہتے۔ میں نے زندگی میں ہمیشہ مقابلوں سے لطف اُٹھایا تھا، وہ کھیل ہو یا صنعتی میدان، مگر الیکشن میں مدِ مقابل کوئی فرد یا تنظیم نہیں بلکہ ایک نظریہ تھا اور اس سے ٹکرانے کا مزا ہی اور تھا۔ الیکشن گولف کی طرح ہوتا ہے جس میں ٹی پر آنے کے بعد آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہوتا، صرف آپ کی سوچ اور فیصلہ کرنے کی اہلیت آپ کے واحد ہتھیار ہیں۔

مجھے اس مقابلے کا بہت مزا آیا۔

میرا مخالف تین شادیاں کر چکا تھا۔ کئی برسوں سے اس کی ذاتی زندگی کا طریقہ نئی شادی یا داشتہ کی تبدیلی تھی۔ اس کی مستقل رہائش وفاقی دارالحکومت میں تھی جہاں اس کے دو گھر تھے اور دونوں شہر کی مخالف سمتوں میں۔ بدرالدین دو سال ایک بیوی کے ساتھ گزارتا تو اگلے دو سال داشتہ کے ساتھ۔ وہ الیکشن یا کسی عدالت میں پیشی پر ہی اپنے شہر آتا۔ اس غیر حاضری کے باوجود بدرالدین ہارتا نہیں تھا، صرف بادشاہ گروں کی وجہ سے۔ یہ لوگ اس سے خائف اور مرعوب تھے۔

الیکشن میں مقابلے کی شدت کا مجھے احساس نہیں تھا...... اس عمل میں تین قوتوں سے ٹکرانا ہوتا ہے، مخالف کی ذہانت، اس کا نظریہ اور اس کے مخالفین کی عددی طاقت۔ میرے پیچھے عبدالمجید کی منصوبہ بندی تو تھی لیکن جیتنے کے لیے لامحدود سرمایہ چاہیے ہوتا ہے۔ میرے کئی دفاتر کھول دیئے گئے تھے جہاں ہر وقت خورد و نوش کا سلسلہ رہتا۔ میری تین صنعتیں ہیں۔ عبدالمجید کی ہدایات کے مطابق میں اگر چمڑے یا بافت سازی سے منسلک لوگوں کے پاس جاتا تو اپنے جوتوں کے کارخانے کی وجہ سے ان سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا۔ اسی طرح ٹیکسٹائل اور لوہے کی صنعتوں کی بدولت کئی برادریوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ الیکشن کے پہلے مرحلے میں، میں نے بادشاہ گروں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ میں اپنے حلقۂ انتخاب میں ہر گھر گیا۔ اکثریت سے ذاتی رابطے نے ووٹروں کو میری طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں ہم نے انتخابی پہیئے کو اُلٹا گھمایا دیا تھا۔ بادشاہ گر جھنجھلاہٹ کا شکار ہونا شروع ہو گئے۔ ووٹران سے جان خلاصی کے لیے بدرالدین کو جتانے کا جھوٹا وعدہ تو کر لیتے لیکن وہ لوگ ووٹروں کی نبض پہچانتے تھے۔ انہیں بدرالدین کی امداد سے ہاتھ کھینچنے کے علاوہ کوئی راہ نظر نہ آئی۔ یہ لوگ تعداد میں گیارہ تھے۔ سب سے پہلے دو نے رابطہ کیا کہ وہ میرے کیمپ میں آنا چاہتے ہیں، صرف میں ان دونوں کے گھروں میں جاؤں۔ مجھے باور کرایا گیا تھا کہ کسی گھر ایک ووٹ تک مانگنے کے لیے جانے میں کسی قسم کی جھجک یا ہتک محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ چناں چہ میں ان دونوں سے طے شدہ مقام پر ملا جو ان میں سے ایک کا گھر تھا۔ وہاں ایک ضیافت کا اہتمام میرے خرچ پر ہوا، جو بظاہر ان کی طرف سے تھی۔

انتخابی مہم کی شدت میرے مزاج کے مطابق نکلی۔ اس میں مقابلے کی کوئی حدیں مقرر نہیں تھیں۔ آپ کے جی میں جو آئے کہہ جائیں بشرطیکہ اس کا جواز پیش کیا جا سکے۔ میں نے بدرالدین کے سیاسی کردار اور اس کی فیوڈل سوچ کی دھجیاں اُڑا دیں۔ بادشاہ گر مجھے اپنا لیڈر تسلیم کر چکے تھے۔ بدرالدین کو اپنی شکست یقینی محسوس ہونے لگی تو وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا۔ میں اس کی ذاتی زندگی کو کسی بھی سطح پر زیرِ بحث نہیں لایا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایک جلسۂ عام میں مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں نے پری کے ساتھ کھیل کھیل کے قتل کرا دیا ہے۔ اگر یہ غلط ہو تو میں پری کو عوام کے سامنے لاؤں۔ یہ میرے سمیت پوری ٹیم کے لیے ایک غیر متوقع موڑ تھا جس نے ہمیں صحیح معنوں میں جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ ہم تمام رات اس مشکل سے نکلنے کا حل تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں رہے۔ صبح مایوسی کے عالم میں دو گھنٹے کے بعد دوبارہ اکٹھے ہونے کے لیے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے اخبار دیکھے تو سب میں پری کی پریس کانفرنس کی تفصیل تھی۔ اس نے اپنے زندہ اور سلامت ہونے کی خبر دی تھی۔

پری نے الیکشن پلیٹ میں رکھ کے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

انتخابی مہم معطل کر کے میں اُس رات فرزندِ قربان کے ساتھ فلیٹ پر دیر تک بیٹھا، میں پری کے بارے میں گفتگو کیے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے خاموشی کو بہتر جانا۔ مجھے الیکشن میں یقینی کامیابی سے زیادہ پری کے رابطہ کرنے کی خوشی تھی۔ الیکشن کی سرگرمی میں، میں پری کو بھول گیا تھا۔ اس تمام گہما گہمی میں مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ جب اچانک مجھے یہ احساس ہوا تو میرے دماغ نے اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا مگر پھر آہستہ آہستہ ندامت نے مجھے سچ کی روشنی دکھائی...... مجھے اس عرصے میں پری کا خیال نہیں آیا تھا۔ انتخابی جنگ غالباً اس گوشت خور کی طرح ہے جو اپنے علاوہ ہر دوسرے کو کھا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اب وہ واپس آ گئی تھی اور میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی اسے دور نہیں کروں گا......!!

فرزندِ قربان نے پری کے بارے میں گفتگو کرنے سے گریز کیا۔ میری حالت اس بچے کی سی تھی جو سکول سے واپسی پر راستہ بھول کر بھی گھر پہنچ جائے۔ میرے اختیار میں ہوتا تو شاید دوبارہ سکول نہ جاتا...... اگلی صبح دوبارہ الیکشن کی مصروفیات مجھے نگل گئیں لیکن میں راستہ نہیں بھولا۔ واقعات نے مجھے درون بین بنا دیا۔

III

میں مادہ پرستی کی عمدہ مثال تھا۔ مجھے زندگی کی کامیابی کا واحد ذریعہ دولت نظر آئی۔ یہ دولت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، جسمانی اور معاشی صحت۔ میرا نظریہ تھا کہ یہ دونوں کامیابی کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر میں صحت مند ہوں تو زیادہ محنت کر کے مزید دولت کما سکوں گا۔ یہی دولت مجھے سکون اور خوشی دے گی۔ اسی احساس نے مجھے سب سے دور رکھا۔ مجھے اپنی برتری کے اندر کمتری کا شدید احساس چھپا نظر آیا۔ اس سوچ کے پیچھے حسب نسب میرا منہ چڑا رہا تھا۔ مجھے اس کا احساس پہلی دفعہ امریکہ میں دوران تعلیم میں ہوا۔ ہم چند دوست جب بھی اکٹھے بیٹھتے تو کبھی کبھار یورپین لڑکے امریکیوں سے ان کے آباؤ اجداد کی معتبری اور کردار کے بارے میں پوچھتے تو میرے کانوں کی لویں سرخ ہو جاتیں۔ امریکی جواب دیتے کہ تم اپنی تہذیب اور اقدار کی حفاظت کرو ہم دنیا پر حکومت کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ میں جب اپنی خاندانی اقدار اور روایات کے بارے میں سوچتا تو مجھے سامنے Cul de sac نظر آتی۔ میں کسی قسم کی اقدار یا روایات کا تعین کرنے کے بجائے اپنے کاروبار میں مزید غرق ہو جاتا۔ یہی غوطہ زنی میری زندگی کا اہم ترین جزو بن گئی۔ میں Deep Sea Diver بن گیا۔ کاروبار کے تمام جائز و ناجائز ذرائع کا استعمال میرا شعار تھا۔

بعض اوقات میں شدید گھٹن کا شکار ہو جاتا۔ میں اپنے اردگرد دیکھتا تو لوہے کی دیواروں سے میری نظریں ٹکراتیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوسرے لوگوں سے اپنا موازنہ کیا کروں گا، ممکن ہے اس سے مجھے اپنی گھٹن کی قبر میں کسی درز سے روشنی نظر آ جائے۔ میرے اردگرد ماتحت تھے جن سے موازنہ کرنا بے سود تھا۔ میں فرزندِ قربان سے اپنا مقابلہ کرتا۔ ہم دونوں کا پس منظر ایک سا تھا۔ اس کی مادی ترقی میرے مقابلے میں بہت کم تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زندگی کی دلدل میں اپنی ناک تک دھنسا ہوا ہے۔ اس کے جوان بیٹے اور بیٹیاں اپنی زندگیوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ فرزندِ قربان اور اس کی بیوی بڑھاپے کی طرف بڑھنے کے عمل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی خواہشات حدود کے اندر ہیں اور وہ لدی پھدی سپر مارکیٹ سے وہی اشیا خریدتے ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے۔

یہ موازنہ میرے لئے مزید باعثِ افسردگی بنتا۔

ایک دن میں نے شفقت کو دفتر میں سامنے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”یہ ایک ذاتی نوعیت کی ملاقات ہے۔“

”کیا تم نے کبھی کچھاؤ محسوس کیا ہے؟“

میں نے بات شروع کی۔

شفقت نے میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

”جی ہاں۔“

”کب؟“

”جب بھی مجھے ایسا فیصلہ کرنا پڑے جو آپ کو برہم کر سکتا ہے۔“

اس نے سچائی سے جواب دیا۔ میں نے اسے سچ بولنے کو تو نہیں کہا تھا لیکن غالباً وہ یہ حقیقت میری آنکھوں میں پڑھ گئی۔

”کیوں؟“

”آپ غلطی برداشت نہیں کر سکتے۔“

”کیسے؟“

مجھے اپنے اندر سے نکلتی جارحیت کو روکنا پڑا۔

"آپ ہر کام کی تکمیل اُصولوں کے مطابق چاہتے ہیں۔ ان میں انسانی جذبوں کا عمل نہیں ہوتا۔"

"تمہارا مطلب کہ میں میکینکل ہوں؟"

وہ تھوڑی خائف نظر آئی۔

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور Predictable بھی؟"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"سر"

وہ آرام سے ہوگئی۔

"تم میری ماتحت ہو...... تم کیا چاہو گی کہ مجھے کیسے رہنا چاہیے؟ ہر وقت کھچاؤ میں، آرام سے یا دونوں کا جوڑا؟"

وہ تھوڑا مسکرائی۔

"آرام سے۔"

"کیا یہ ممکن ہوگا؟"

"نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ گھبرا سی گئی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔

"کیا اسے ممکن بنایا جا سکتا ہے؟"

اس دفعہ وہ کچھ نہیں بولی۔

"میں چاہوں گا کہ ایسا کیا جائے۔"

"کیسے؟"

اس کی سرگوشی بمشکل مجھ تک پہنچی۔

"مجھے اپنے جیسا انسان سمجھ کے، میں اگر غلطی کروں تو اُس کی درستی تجویز کر دی جائے۔ ایسے مشورے پر عمل کروں گا۔"

حمیدی

میں خاموش ہو گیا۔

"کیا تمہیں کبھی depression ہوا ہے؟"

"اکثر...... مگر اُس طرح نہیں جیسے آپ کو ہوتا ہے۔"

اُس کے لہجے میں اعتماد تھا۔

"تو؟"

"کسی دوست کا مسئلہ، کسی اہل خانہ کی تکلیف، ہمسائے یا جاننے والے کی ایسی مشکل جس سے اُس کو دکھ پہنچا ہو۔"

میں اپنی مشکل سمجھ گیا۔

ہر انسان کی زندگی میں چھوٹے چھوٹے غم اور خوشیاں ہوتی ہیں۔ میں ان جذبوں سے شناسا نہیں تھا۔ مجھے سوائے اپنی ذات کے کسی سے غرض نہیں تھی۔ اب میں نے ان گرہوں کو کھولنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے اندر اس طرح غرق رہا کہ کبھی کھل کر ہنسا ہی نہیں تھا۔

"کیا تم کھل کے ہنستی ہو؟"

میں نے اچانک پوچھا۔

"جی ہاں...... اور اسی طرح روتی بھی ہوں۔"

شفقت سے اس بات چیت کے بعد میں نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔

مجھے لگا کہ میرے ساتھ عملے کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ بیشتر مجھے دیکھ کر راستہ تبدیل کرنے کے بجائے سلام کرتے پاس سے گزرتے۔ میں بھی مسکراتے ہوئے جواب دے کر حال چال پوچھتا۔

یہ میرے لیے بہت اہم نفسیاتی تھیراپی تھی۔

میں نے ناقابلِ عبور رکاوٹ پار کر لی تھی۔ مجھے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی اہمیت کا پتا چلنا شروع ہو گیا۔ میرے لوگ بعض اوقات اپنے معاملات پر رائے لینے کے لیے بے دھڑک چلے آتے۔ میرا رویہ اُن کے ساتھ دوستانہ اور ہمدردانہ ہوتا۔

میرے لیے یہ انکشاف بہت اہم تھا۔

IV

ایک رات میں نے فورمین کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ دکھ کی بات تھی کہ مجھے اس کا نام تک بھول چکا تھا۔ دفتر کے ریکارڈ اُلٹ پلٹ کرنے کے بعد مجھے اُس کا نام اور پتا معلوم ہوا۔ اس کا نام عبدالنبی تھا اور اس کا خاندان شہر کے ایک غیر معروف علاقے میں رہتا تھا جہاں سے وہ لوگ نقل مکانی کر چکے تھے۔ اتنا پتا چلا کہ عبدالنبی کی بیوہ عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہے۔ اس کے دو بیٹے ہیں جن میں ایک موٹر میکینک ہے۔ جب کہ دوسرے کے بارے کوئی خبر نہ مل سکی۔

یہ نامکمل اطلاع تلاش شروع کے لیے کافی تھی۔

میں نے تلاش شروع کر دی۔

مجھے ایسے موٹر میکینک کی تلاش تھی جس کے باپ کا نام عبدالنبی تھا اور اس کا پتا معلوم نہیں۔ اس مشق میں اپنے عملے کے کسی بھی فرد، یہاں تک کہ شفقت کو شامل کرنا دانش مندی نہیں تھی۔ میں جلدی میں نہیں تھا لیکن ساتھ ہی معاملے کو تعطل کا شکار ہونے دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرے پاس شہر کی تمام ورک شاپوں کی تفصیل ہو۔ یہ فہرست اکٹھی کرتے مجھے کافی عرصہ لگا۔ میں تھوڑے وقفے کے بعد ان ورک شاپوں کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ مجھے اپنے ہم عمر، ایک آدھ سال چھوٹے یا بڑے آدمی کی تلاش تھی۔ ایک ورک شاپ میں مجھے تھوڑی کامیابی ہوئی۔ ورک شاپ کا مالک قدرے عمر رسیدہ آدمی تھا۔ اُس سے جب میں نے پوچھا کہ کیا عبدالنبی مرحوم کا بیٹا اس کے پاس ملازم رہا ہے۔ تو وہ سوچ میں پڑ گیا، کافی دیر ذہن پہ زور دینے

کے بعد اس نے کہا:

‘‘غالباً 1955ء کی بات ہے۔ ایک لڑکا میرے پاس کام کرتا تھا۔ اُس کے باپ کا نام کچھ ایسا ہی تھا اور وہ بیوی اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا، غالباً کسی عورت کے ساتھ۔ وہ لڑکا بہت اچھا اور تابعدار تھا اور اسے سیکھنے کا بھی شوق تھا۔ اس نے بہت لگن سے کام سیکھا۔ ہمارے ہاں شاگرد کم از کم چار سالوں میں مستری بنتا ہے جب کہ وہ صرف تین سالوں میں سیکھ گیا۔’’

‘‘آپ کو اس کا نام یاد ہے۔’’ میں نے اُس کے خیالات کا تسلسل توڑا۔

‘‘بھلا سا نام تھا اس......!’’ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

‘‘ہاں یاد آیا محمد سرور...... ہم اسے سرو کہتے تھے۔’’

‘‘آپ کو یاد ہوگا کہ اس کی رہائش کہاں تھی؟’’

‘‘اب تو ہر بات یاد آ رہی ہے۔ وہ گوبند پور میں رہتے تھے۔ آج کل اسے مصطفیٰ آباد کہتے ہیں۔ آبادیوں اور بستیوں کے ناموں کا بھی عجیب قصہ ہے۔ ہم پرانے لوگ انہیں پرانے ناموں سے یاد رکھتے ہیں اور نوجوان نئے نام سے...... کبھی کبھار اس کی ماں ہم سب کے لیے کھانے کو اچھی چیز پکا کر لایا کرتی تھی...... ان دنوں اچھا کھانے پینے کا اتنا رواج نہیں تھا، صرف زندہ رہنے کے لیے کھایا جاتا تھا، چسکے کے لیے نہیں۔ اس کی ماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ وہ برتن اُٹھا کے آ جاتی اور ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ کھانے کے وقفے میں ہم اس کے گرد بیٹھ جاتے۔ وہ ہم سب کو اپنے ہاتھ نکال کر دیتی۔ سب سے پہلے مجھے اور آخر میں سرو کو۔ وضع داری تھی تب۔ اب تو جناب...... میری بہوئیں اپنے بچوں کو دے کر اپنی تھالی، پھر خاوند کی اور بچا ہوا مجھے دیتی ہیں۔’’ وہ خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی سوچ وقت کا موازنہ کرنے میں صرف ہوتی ہے۔

‘‘کچھ معلوم ہے وہ کہاں گیا؟’’

‘‘ہمارے شاگرد جب اپنے آپ کو مستری سمجھنے لگیں تو ایک دن بغیر اطلاع کے رفو چکر ہو جاتے ہیں۔’’ اس نے اپنے پیشے کی اخلاقیات پر روشنی ڈالی۔

‘‘ایک دن سرو کام پر نہیں آیا۔’’

میں شکریہ ادا کر کے اُٹھ آیا۔

مجھے تھوڑی آسانی نظر آئی۔ سرور نامی مکینک کسی وقت گوبند پور میں رہتا تھا۔ گوبند پور شہر کے درمیان میں ایک چھوٹا سا محلّہ ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں دو یا تین دنوں میں گوبند پور کی تمام گلیاں کھوج لوں گا۔

جو کام بظاہر آسان نظر آیا حقیقتاً ایسا تھا نہیں۔

گوبند پور شہر کے وسط میں واقع ہے۔ اس لیے وہاں ورک شاپ نہیں ہو سکتی۔ میں ایک شام چکر لگانے کے ارادے سے نکلا اور کار مناسب جگہ پر ڈرائیور کے حوالے کر کے اس طرف چ پڑا۔ گوبند پور کی گلیوں میں تلاش شروع کر دی۔ میں اپنے جنون میں قطعاً بھول گیا کہ گلیوں میں گھوم کر سرور کو ڈھونڈنا حماقت ہے۔ میں تقریباً دو گھنٹے گلیوں میں گھومتا رہا۔ پہلی دفعہ تھی کہ میں شہر کی گلیوں میں نکلا۔ بعض اوقات اچانک گلی بند ہو جاتی تو کسی سے پوچھ کر وہاں سے نکلنے کا راستہ معلوم کرتا۔

اُس رات اپنی مہم کے بارے غور کرتے کھلا کہ مجھے وہاں گھومتے مزہ آیا۔ میں اگلی شام دوبارہ گیا۔ جن گلیوں میں پچھلی شام جھجکتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا، مجھے مانوس لگیں۔ گوبند پور میں زیادہ تر پرانے طریقے کے دو منزلہ مکان تھے۔ یہ مکان وقت کے ساتھ تھوڑا اندر کی طرف جھک آئے تھے۔ گلیاں سطحِ زمین پر کھلی تھیں لیکن آسمان کی طرف دیکھتے دونوں اطراف کا فاصلہ کم لگتا۔ گلیاں تنگ، تاریک اور ناہموار تھیں ماسوائے ان چند گھروں کے جن کے سامنے قمقمے روشن تھے۔

گوبند پور میں دو بازار تھے جو غروبِ آفتاب کے بعد بند ہو جاتے، صرف چائے کے کھوکھے اور پان سگریٹ کی دکانیں کھلی ہوتیں۔ لڑکے بالے دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ کر گپ لگا رہے ہوتے۔ مخصوص تھڑوں پر روزانہ وہی لوگ بیٹھے ہوتے۔ ہر گروہ خوش گپیوں میں مصروف ہوتا اور بعض اوقات ان کے قہقہے میرا تعاقب کرتے۔

میں وہاں گھومتے اس ماحول میں اتنا گم ہو گیا کہ مجھے اپنا مدعا بھولتا محسوس ہوا۔ یوں لگا کہ وہ گلیاں مجھے اپنے اندر جذب کر رہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود ان میں کھوتا چلا گیا۔ میں ہر رات گوبند پور جانے لگا۔ مجھے وہاں کے لوگ جاننے پہچاننے لگے تھے اور بعض قریب سے گزرتے سلام کرتے اور کچھ کو میں بھی کہتا۔ میرا جی چاہتا کہ میں تھڑوں پہ بیٹھے، ہنستے، کھیلتے، نوجوانوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں مگر عمر اور کسی حد تک میرا مقام رکاوٹ بن جاتا۔ میں اس طریقِ زندگی سے واقف تو نہیں تھا مگر مجھے اس میں ایک مخصوص قسم کا اخلاص نظر آیا۔ یہ لوگ قریب سے گزرتے سلام کرتے اور بوقتِ ضرورت دل کھول کر ہنستے، جہاں میں رہ رہا تھا وہاں مجھے اب تک اتنے قہقہے سنائی نہیں دیے جتنے چند دنوں میں یہاں سن لیے تھے۔

میں وہاں رات کے مختلف اوقات میں جانے لگا۔ اکثر گلیاں خالی ہوتیں مگر لگتا کہ لوگوں سے بھری ہیں۔ اردگرد کے گھروں میں بستے لوگ وہاں رونق افروز محسوس ہوئے۔ مجھے ہر گھر کا دروازہ گلی میں کھلنے کے بجائے درمیان میں واقع نظر آتا۔ محسوس ہوتا کہ میں گلی کے بجائے ایک گھر سے دوسرے میں جا رہا ہوں اور گلی تو وہاں ہے ہی نہیں، قہقہے اور دوسری آوازیں گھروں کے بجائے گلیوں سے اُٹھ رہی ہیں۔ صحنوں میں عورتوں کی گفتگو اور خانہ داری کی دیگر آوازیں بہت مانوس لگتیں۔

وہاں روزانہ پھرنا زندگی کا معمول بن گیا۔ ان گلیوں میں کوئی انجان قسم کا نشہ تھا جو مجھے کھینچ کر لے جاتا۔ میں سرور کو بھول کر وہاں سے سکون کا لطف کشید کرنے لگا۔ سگریٹ پان کی دکانوں پر ٹیلی ویژن لگے ہیں۔ لوگ اپنی ضروریات خریدتے ایک نظر سکرین کے نظارے پر ضرور ڈالتے۔ میں ایک دکان کے پاس کھڑا تھا۔ چھت سے تھوڑا نیچے رکھے ٹی وی پر وی سی آر سے ایک ناقابلِ نظارہ فلم لگی تھی۔ دکان پر گاہک نہیں تھی۔ دکان کے اندر ایک تیس یا بتیس سال کا آدمی اور پندرہ سولہ برس کا لڑکا تصویریں دیکھ رہے تھے۔ آدمی نے برف کے ڈبے سے ایک پانی کی بوتل نکال کر اُسے گلاس میں انڈیلا اور پھر دوسری بوتل سے کوئی مائع ڈال کے چکھا۔ لڑکا یہ ساری کاروائی دیکھ رہا تھا۔ آدمی نے اثبات میں سر ہلا کے دوسرے گلاس میں دونوں چیزیں انڈیل کر لڑکے کو تھما دیا جس نے ایک گھونٹ لیا اور آدمی نے بھی یہی عمل کیا۔ تب ان دونوں نے مجھے دیکھا۔ آدمی نے ایک آنکھ میچتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

’’چاہیے صاحب......سالے جاؤ گے۔‘‘

اُس نے لڑکے سے سوال کیا۔

میرے جواب سے پہلے ہی لڑکا بول پڑا۔

”نہیں۔“

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انہوں نے ایک ایک گھونٹ اور پیا۔

”کیوں سالے...... جاؤ...... صاحب اچھے آدمی نظر آتے ہیں۔“

”نہیں...... بوڑھوں کی مانگیں بہت ہوتی ہیں اور آخر میں......“

اس نے بڑی ادا سے انگوٹھا نیچے کر کے مایوسی کا نشان بنایا۔ جب وہ یہ عمل کر رہا تھا تو میں اچانک بول اُٹھا۔

”میں قطعاً بوڑھا نہیں ہوں......“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”...... میرا یہ شوق نہیں۔ میں بالکل نارمل آدمی ہوں۔ دراصل مجھے کسی کی تلاش ہے۔“

میں جھینپ کر تیزی سے یہ سب کہہ گیا۔

”صاحب! میں اس محلے کا پیدائشی ہوں شاید مدد کر سکوں۔“

آدمی اپنا گلاس خالی کر چکا تھا جب کہ لڑکے کے گلاس میں تقریباً ایک گھونٹ باقی تھا۔

”ختم کرو سالے...... صاحب کیا سوچیں گے۔“

اس نے دوبارہ گلاس بنائے۔ میں دونوں میں اتنا غرق ہو گیا تھا کہ اگر مجھے پیش کش کرتے تو شاید قبول کر لیتا۔

آدمی نے ٹیلی ویژن بند کیا تو لڑکے نے اس کے کندھے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔

”جی صاحب! آپ کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”میں چند دنوں سے یہاں آ رہا ہوں۔“

وہ خاموش رہا۔

”مجھے ایسے آدمی کی تلاش ہے جسے میں جانتا نہیں۔ اُس کا نام سرور ہے...... سرور مستری، وہ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے یہاں...... یعنی گوبند پور میں رہتا تھا...... میری عمر کا ہونا چاہیے۔“

مجھے اُس کی آنکھوں میں بے یقینی نظر آئی۔

اُس نے کچھ سوچتے ہوئے ایک گھونٹ لیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”محمود......“

وہ ابھی تک کچھ طے کرنے کی کوشش میں تھا۔

”دیکھیں صاحب! مجھے کوئی چیز مانوس سی لگ رہی ہے...... آپ نے سرور مکینک بتایا تھا؟“

”یہی نام ہے۔“

میں شوق سے بولا۔

”سالے...... کیا میری ٹانگ توڑے گا؟ اُدھر ہٹ...... میں چاچے چھمن کو لاتا ہوں۔“

وہ دکان سے نیچے کود گیا۔

”تم اس پر کب سے ہو؟“

میں نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکے کی مسکراہٹ نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

”ضروری ہے بتانا۔“

اُس کے لہجے میں زنانہ شیرینی کا گاڑھا پن تھا۔

”بہتر یہی ہے۔“

میرا لہجہ قدرے سخت تھا۔

”صحیح بات ہے صاحب، مجھے یاد نہیں۔ باؤ اور میں ایک عرصے سے روزانہ یہی کرتے ہیں...... اور...... بس......“

اُس نے ایک دم یہ سب اُگل دیا۔ اُس کا انداز اپنی صنف کا رنگ لیے تھا۔

”کام کیا کرتے ہو۔“

”صاحب! میں دنیا میں اکیلا ہوں...... کوئی ذمے داری نہیں۔ باؤ ہی میرا بندوبست کرتا ہے۔ میری کوئی اتنی ضرورتیں بھی نہیں۔ جوڑا کپڑوں کا اور......“

”کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ میں تمہیں ملازمت دلوا سکتا ہوں۔“

”آپ کا کام مشکل ہوگا اور پھر یہ سب...... نہیں! میں آرام طلب ہو گیا ہوں۔ باؤ جب

تک رکھے گا ٹھیک ہے۔ پھر کہیں اور سہی۔"

اس کی آواز میں کرب تھا۔

"بعد میں کیا کرو گے؟"

مجھے واقعی پریشانی تھی۔

"وہی جو چاچا پھمن کرتا ہے۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

میں نے دلچسپی اور تجسس سے پوچھا۔ پھمن کا نام میرے لیے اسرار بن گیا تھا۔

لڑکا جواب دینے کے بجائے تلخی سے ہنسا۔

محمود ایک بے ڈول سے آدمی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ غالباً وہی چاچا پھمن تھا۔ اُس کے گلے میں موٹے منکوں کی مالا تھی اور دونوں کلائیوں پر گجرے بندھے تھے۔ پھمن کی عمر کا تعین کرنا مشکل تھا، وہ پینتالیس سے ساٹھ کے درمیان کسی بھی سن کا ہو سکتا تھا۔ اس نے جس انداز سے میرا جائزہ لیا میں اس کی جنس جان گیا۔ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے محمود اور پھمن کی طرح کے لوگوں سے پالا پڑا تھا۔

حمیدی

"آپ کو جانتا ہوں۔" پھمن نے مترنم آواز میں کہا۔ "دراصل میں شہر کے ہر خاندان سے واقف ہوں۔ آپ صنعت کار اور سیاست دان ہیں، نام ظاہر نہیں کروں گا...... آپ کو کسی مکینک کی تلاش ہے؟"

محمود واپس دکان میں چلا گیا۔ اس نے اپنا گلاس سنبھالا اور بظاہر ہماری موجودگی سے بے خبر ہو گیا۔

"محمد سرور عرف سرو کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

میں نے احتیاط سے جواب دیا۔

"عبدالنبی کا بیٹا۔ آپ کے والد بزرگوار اور عبدالنبی کا گہرہ تعلق تھا"

پھمن نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں حقیقت جاننے کے لیے دیکھتے رہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ عبدالنبی کے انجام کے بارے میں مشکوک تھا اور وہ اپنے اس خدشے کی میری جسمانی زبان سے تائید چاہتا تھا۔ میں پلکیں جھکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"دراصل مجھے لوگوں اور خاندانوں کو جاننے کا شوق ہے۔ ہم چند دوست اپنے اڈے پر بیٹھیں تو عموماً ہمارا موضوع یہی ہوتا ہے۔ آپ جتنی ماشااللہ کسی اور نے ترقی نہیں کی"

پھمن نے جیب سے سگریٹ نکالا۔

"پھلکے...... پان دو۔" اس نے لڑکے کو سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

پان منہ میں رکھنے کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا۔

"سرو اچھا آدمی ہے کیوں کہ اس نے زندگی بھر محنت کر کے کھایا ہے۔ اس کے حالات بہتر ہوتے اگر وہ اپنے بھتیجے کو بیٹی نہ دیتا...... عزیز انتہائی گھٹیا آدمی ہے۔ وہ سرو سے اپنے گھر کو چلانے کے اخراجات وصول کرتا ہے جب کہ سرو کا اپنا خاندان بھی کافی بڑا ہے......"

میں دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ یہ لوگ ہماری باتیں سننے کے بہانے محمود سے سگریٹ اور پان وغیرہ خرید رہے تھے۔ آغاز میں مجھے خفت کا احساس ہوا تھا، مگر پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میں ایک مقصد لے کر آیا تھا۔ سرو سے ملنا ممکن ہو رہا تھا تو میں نے ہر قسم کی جھجک کو بالائے طاق رکھ دیا۔

"سرو کی بڑی سڑک کے ساتھ والی گلی میں ورک شاپ ہے۔ اس کا کام اتنا زیادہ نہیں لیکن اس کا شمار اچھے مستریوں میں ہوتا ہے۔ اس کی رہائش بھی وہیں ہے۔ انہیں یہاں اب کوئی نہیں جانتا۔ اس تمام عرصے میں دو نسلیں یہاں آباد ہو چکی ہیں۔"

"عزیز کیا کرتا ہے؟"

"وہ سینٹری کا سامان بنانا جانتا ہے۔ اپنے کام میں ماہر ہونے کے باوجود فارغ ہے۔ سرو اُس کی کفالت کرتا ہے اور وہی اس کا پتا بھی بتا سکتا ہے۔"

پھمن خاموش ہو گیا۔ غالباً بتانے کو اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے اُسے پانچ سو روپے کا نوٹ دیا اور محمود کو خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

V

یا میں کسی خواب کے تعاقب میں تھا یا وہ میرے پیچھے بھاگ رہے تھے یا میں خود کسی خواب میں گم تھا۔ بعض اوقات مجھے اپنے اردگرد ہر چیز مصنوعی محسوس ہوتی یہاں تک کہ اپنا جذبہ پھیکا اور اس سائے کی طرح جسے روشنی کی پہلی کرن نگل جاتی ہے۔ یہ سوچ کہ کیا میں کامیاب ہوں، مجھے وسوسوں کی ناہموار گلیوں میں بھٹکاتی رہتی اور پھر کہیں سے، دبے پاؤں ایک خیال در آتا کہ میں اپنی زیست کے ہر موڑ کے اس طرف کامیابی کے رنگ کیوں دیکھنا چاہتا ہوں۔ غالباً میری ایک عرصے تک کسی اور جذبے سے شناسائی نہ تھی تاوقت یہ کہ پری سے میرا ہیڈ آن Collission ہوا۔

دراصل پری ہی Rerversal کی وجہ تھی۔

پھمن سے ملاقات کے بعد دیر تک جاگتا رہا۔ آہستہ آہستہ مجھ پہ کھل رہا تھا کہ میں یہ سب کچھ اپنے لیے نہیں بلکہ پری کے لیے کر رہا ہوں۔ ہر وقت مجھے احساس رہتا کہ وہ میرے ساتھ سائے کی طرح موجود ہے اور یہی میری مضبوطی کا نقطہ بنتا کیوں کہ سایہ اپنی جسامت بدلتا رہتا ہے جب کہ وہ مستقل تھی اور اردگرد ہر چیز عارضی۔

اگلے روز میں سرور سے ملنے گیا

اس کی ورک شاپ ایک ڈیوڑھی میں تھی جس میں ایک کمرہ تھا اور پھر کھلی جگہ۔ ورک شاپ کے بعد چھوٹا سا باغ جہاں مالٹے اور امرود کے چند درخت تھے۔ اس کے دوسری طرف مختصر سا رہائشی علاقہ جزوی طور پر چھپا ہوا تھا۔

نئی گاڑی دیکھ کر سرور کے دو شاگرد بھاگ کر کار کے پاس آئے۔ ایک نے دروازہ کھول کر

مجھے باہر نکلنے میں سہولت دی۔ دوسرا جو پاس کھڑا تھا اس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے یہ ترتیب پسند آئی۔

سرور سامنے متوقع کھڑا تھا۔

اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی لیکن فعال زندگی گزارنے کی وجہ سے کم کا دکھ رہا تھا۔ وہ غالباً ہفتے میں ایک دفعہ داڑھی منڈواتا اور اس دن ہفتہ پورا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور متحرک تھیں۔

مجھے محسوس ہوا کہ کار سے اُترنے کے عمل میں اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا، قدرتی سی بات، میں موٹی آسامی تھا۔

اُس نے میلے لباس پہ اپنے ہاتھ صاف کیے اور دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھاما۔ اس مصافحہ میں وہ احتراماً آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔

میرے اندر ایک غلط فہمی ٹوٹ کے حقیقت بن گئی۔ سامنے میرا آدھے کا شراکت دار ادنیٰ سے خدمت گزار کی طرح کھڑا تھا اور بعض اوقات جذباتیت اور حقیقت ایک مضحکہ خیز حالت کو جنم دیتے ہیں۔

غالباً زندگی میں پہلی دفعہ الفاظ میرا ساتھ چھوڑ گئے۔

”میری کار بالکل ٹھیک ہے...... مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے، ذاتی نوعیت کی۔“

اس نے اپنی چھوٹی آنکھیں پوری کھولیں اور اپنی چھاتی کو ملا۔

”خیریت؟“

میں اپنی منافقانہ میٹھی ہنسی ہنسا جس کا مقصد سرور کو اعتماد دینا تھا۔

”میرا نام معظم علی خاں ہے اور آپ مجھے قطعاً نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی شناسائی کم از کم پچپن برسوں سے ہے یا شاید ہم دونوں کی پیدائش سے پہلے کی۔“

”واہ...... خوب“

وہ دلچسپی سے ہنسا اور دو لوہے کی کرسیاں اُٹھا لایا۔ اس نے ایک کرسی موبل آئل لگے جھاڑن سے صاف کرنے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”منے! صاف پیالیوں میں اچھی چائے بنوا کر لاؤ۔“

ایک لڑکا تیزی کے ساتھ ڈیوڑھی سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔

”میرے باپ نے آپ کے والد سے ایک دفعہ اُدھار لیا تھا اور یہ کسی کے علم میں نہیں۔ پچھلے دنوں میں خاندانی کاغذات دیکھ رہا تھا تو یہ بات مجھے معلوم ہوئی۔ میں آپ لوگوں کی تلاش

میں نکل پڑا۔ رات کو گوبند پور میں کسی پٹھمن سے ملاقات ہوئی اور آپ تک پہنچا ہوں۔‘‘

’’بڑی بات ہے جی! آج کل تو لوگ فوت ہونے والے کے ذمے رقم نکال کرادائی چاہتے ہیں۔‘‘

چائے آ گئی۔ پیالیاں کافی گندی تھیں۔ میں نے سوچا گندی پیالیوں میں چائے کیسی ہوگی۔ میں نے ایک چسکی لی۔ حیرت کی بات کہ چائے کا ذائقہ اچھا تھا۔

’’مجھے آپ کے گھریلو حالات کا علم ہے۔ میں دونوں بھائیوں کو حصہ دینا چاہتا ہوں۔ ادائی کا طریقہ کار میرا اپنا ہے۔ میں نقد نہیں دے رہا بلکہ آپ دونوں کو کاروبار قائم کر کے دوں گا۔‘‘

’’یقین نہیں آ رہا!! یہ تو خواب والی بات ہے۔ آپ سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے یہ مذاق نہیں ہوسکتا۔‘‘

سرور بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت میں تھا۔ اس کی آنکھیں اپنی حرکت کھو کر مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

’’یہ سچ ہے۔ اپنے آپ کو چٹکی کاٹ کر دیکھ لیں۔‘‘

’’واجب الادا رقم کتنی ہے؟ پابند نہیں ہوں کہ بتاؤں لیکن آپ کو ترقی کی راہ پر ڈالنا میرا سماجی اور اخلاقی فرض ہے...... آپ مکینک ہیں۔ میں ایک جدید ورک شاپ اور سیکنڈ ہینڈ کاروں کا شوروم کھول کر دے سکتا ہوں۔‘‘

سرور کی چھوٹی آنکھیں اور سکڑ گئیں اور منہ کو کھولے مجھے حیرت سے دیکھے جا رہا تھا۔ میں اس کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ میں اس کے لیے دولت کا خزانہ تھا اور وہ مجھے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے یہ خاموشی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر وہ بولا تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔

وہ مجھے دیکھتا رہا۔

’’اَب ہم فیصلہ کریں کہ کون سی جگہ موزوں رہے گی۔‘‘

سرور کی تمام دنیا میرے وجود میں سکڑ گئی تھی۔ اس کی نظریں میرے بیان کی صداقت جاننے کے لیے میرا چہرہ ٹٹولے جا رہی تھیں۔ سچی بات ہے کہ میں اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ساتھ ہی مجھے سرور کی نئی اُمید کے کنوارے پن کو سلامت رکھنا تھا۔

’’یہ جگہ کس کی ملکیت ہے۔؟‘‘

’’یہ احاطہ ایک مغل خاندان کی ملکیت ہے اور میں ان کا کرایہ دار ہوں......‘‘

وہ جھجک کے سبب قدرے ہکلایا۔

’’وہ اسے بیچنا چاہتے ہیں۔‘‘

سرور کے اس انکشاف نے میرے منصوبے کی تکمیل آسان بنادی۔ کیوں نہ میں اس احاطے کو خرید کر ورک شاپ کی قدرے بہتر سہولت، ساتھ جڑا ہوا شوروم اور عقب میں مناسب سا گھر تعمیر کروادوں۔

اس خیال کی اپنے ذہن میں واضح شکل بنتے ہی میں خود کو ہوا کی طرح ہلکا محسوس کرنے لگا۔ عجیب اتفاق تھا کہ سرور سامنے موجود ہونے کے باوجود کئی بوجھل پردوں کے پیچھے چھپ گیا اور خود میرے لیے وقت تھم گیا تھا۔

فورمین کو میں اس کے آدھے کا آدھا لوٹا رہا تھا۔

’’آپ اُن لوگوں کے ساتھ ملاقات کرادیں۔ سودا طے ہونے کے اگلے روز ہی تعمیر شروع کروادوں گا۔‘‘

احاطے کو خریدنے کی کاروائی میں دو ہفتے صرف ہوئے۔

مجھے تعمیر مکمل کرنے کی جلدی تھی، جس کے لیے تین شفٹوں میں کام ہوا۔ تعمیر کے آغاز کے بعد میں وہاں نہیں گیا لیکن مجھے ہر روز کام کی تفصیل بتائی جاتی۔ یہ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے جلدی کیوں تھی؟

سرور سے میں نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔

’’معظم صاحب! آپ کی ذات اچھائیوں سے بھری ہوئی ہے۔‘‘

مجھے تعریف کی وجہ جاننے میں دشواری نہیں ہوئی۔

’’ذاتی طور پر میں چاہوں گا کہ آپ اُسے مضبوط بنیادوں پہ کھڑا کریں جیسے مجھے کیا لیکن میرا بھائی کام چور ہے۔ اسے کام کرنے کی عادت نہیں۔ وہ چاہے گا کہ آپ اُس کا حصہ اسے نقد دے دیں تاکہ وہ چند دنوں کے بعد پھر مجھے کھانے لگے۔‘‘

سرور پہلی دفعہ اپنے خاندانی مسائل پر کھل کر بولا۔

VI

عزیز شہر کے ایک غلیظ علاقے میں رہتا تھا۔

میں گندگی کے چھوٹے بڑے ڈھیروں سے بچتا اس کے گھر تک پہنچا۔ بو میں سانس لینا دشوار تھا اور ناک پر رکھا رومال بھی بدبو سے بھیگ گیا۔

عزیز اپنے اردگرد کے برعکس سفید شلوار قمیص پہنے تھا۔ ۔ سرور کا تجزیہ تلخ تجربات پر مبنی تھا۔ عزیز نے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے جن میں دھمکی بھی شامل تھی۔ وہ میری منت سماجت کرتا اور کبھی مجھے عدالت تک کھینچنے کی یقین دہانی کراتا۔ چمن اور سرور کی باتوں نے مجھے اس سے نمٹنا آسان بنا دیا۔ اس کی ہر چال پر میرا ایک ہی جواب ہوتا۔

’’جو میں کہتا ہوں اسے قبول کرلو یا ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھو۔‘‘

اس جواب سے وہ سیخ پا ہو جاتا۔ ہم دباؤ کے کھیل میں مصروف تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمام پتے میرے قبضہ میں ہیں اور عزیز کا ہاتھ اناڑیوں والا ہے۔

مجھے اچانک عزیز کے مزاج میں شناسائی کی کشش نظر آئی۔ اس میں سرور کی مٹھاس اور دھیمے پن کے بجائے گستاخی کو چھوتا ہوا اکھڑ پن تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس کی شکل جانی پہچانی لگی اور جب اچانک مڑ کر دیکھتا تو کوئی بھولی ہوئی شکل نظروں کے سامنے گھوم جاتی۔ میں اُسے بھڑکانے کے لیے گفتگو کو طول دیتا رہا۔ اس کے مشتعل چہرے نے میرے ذہن کو بار بار جھنجھوڑ کر جو نقوش سامنے لائے میں انہیں سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن شناسائی ضرور تھی۔

دفعتاً ہر چیز واضح ہوگئی۔

میں کئی حصوں میں بٹ گیا۔ دو بلبوں کے درمیان جھومتا درخت غائب ہوگیا۔ عزیز کی شکل مجھ جیسی تھی۔ مجھے یک لخت ایک مانوس اپنائیت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہت عرصے کے بعد مجھے کوئی بالکل اپنا ملا۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر عزیز کو تھام لوں۔ ہم شاید ایک ہی جسم کے حصے تھے۔ میں اپنے منتشر حصوں کو یک جا کرنے میں مصروف ہوگیا۔ مجھے ان دونوں بھائیوں میں واضح فرق کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ سرور حلیم، منکسر المزاج اور پیار کرنے والا آدمی تھا جب کہ عزیز میں غرور اور ضد تھی۔

اس مختصر وقت میں عزیز جھوٹ کی طرح واضح ہوگیا۔

مجھے وہ اپنا نظر آیا۔ اُس نے زندگی میں کامیابی کے لیے اپنے بیٹے کو ذریعہ بنایا اور سرور کی محنت کے کنویں کے پاتال کا پانی پیتا رہا۔ مجھے کئی جذبوں نے جکڑ لیا اور وہ تمام مجھے مصنوعی لگے۔ میں عزیز کی طرف کھیچ رہا تھا تو مجھے سرور کے ساتھ بے انتہا ہمدردی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے مجھے عزیز کی زندگی اور رویے سے گھن آئی اور سرور اجنبی اور غیر اہم نظر آیا۔ سرور نے ہمارے خاندان کی خود غرضی کا تھپیڑا اپنے مستقبل کے اندھیرے چہرے پر سہا اور عزیز کو اس کی شدت سے بچائے رکھا۔

میرے منتشر حصے یک جا ہونے شروع ہو گئے۔

مجھے اگلے لمحے فیصلہ کرنا تھا۔

عزیز میرے اندر کی جنگ کو نہ سمجھ سکا۔ شروع میں میرا رویہ جارحانہ تھا مگر میرے سکوت نے اُسے پریشان کر دیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے اس طرح دیکھنے کا انداز سرور جیسا قطعاً نہیں تھا جب میں اس کو ورک شاپ میں ملا۔ اس کے ہاں حیرت میں ڈوبی دلچسپی تھی جب کہ عزیز کی حیرت میں شک کا سایہ تھا۔

ہم ایک چارپائی جتنے وسیع و عریض صحن میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ میرے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ گھر کی خواب گاہ اور باورچی خانہ تھا۔ بستر کی پھٹی چادر دروازے میں لٹک رہی تھی اور مجھے پتا تھا کہ گھر کے تمام افراد سوراخوں میں سے ہمیں جھانک رہے ہیں۔ اور ان میں یقیناً سرور کی بیٹی بھی تھی۔ میرے اندر اس لڑکی کے لیے ہمدردی سے سینے میں سانس اٹکتی محسوس ہوئی۔ اگر یہ لڑکی اپنے خاوند سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلے تو عزیز کا ذریعہ معاش کیا ہوگا اور اچانک اس خواہش نے سر اُٹھایا

کہ ایسا ہو۔

”کیا فیصلہ کیا۔“

”آپ کا مفاد کیا ہے؟“

اُس نے پہلی دفعہ جاننا چاہا۔

”میں ایک اخلاقی فرض نبھا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

شاید اُس نے کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

”مجھے کوئی مجبوری نہیں۔“

میں نے اپنی جسمانی حرکتوں سے اشارہ دیا کہ میں جانے لگا ہوں۔

”آپ کا جذبہ میرے لیے قابل احترام ہے۔ اگر میں مدد قبول کرنے کی حامی بھر لوں تو آپ مجھے کیا دیں گے!“

اُس نے پھر پینترا بدلہ۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ وہ سنجیدگی سے میری باتوں پر غور کر رہا ہے۔ مجھے اُس کے لہجے سے اپنے کی بو آ رہی تھی۔ مجھے اپنے خاندان کی نئی شاخ پھوٹتی نظر آئی۔ کوئی سو برس سے کچھ پہلے ایک جد اسی طرح غریب اور مکار تھا۔ اس نے کسی کے اعتماد کو دھوکہ دے کر اپنے خاندان کو ترقی کی پٹری پر دھکیل دیا۔ عزیز بھی غالباً یہی کر رہا تھا لیکن اس کا طریقۂ کار مختلف تھا، اُس نے اپنے دو قریب ترین رشتہ داروں کے یعنی سرور اور میرے اعتماد کے کیڑے کو اپنی مکاری کی مچھلی کے منہ میں اس طرح دیا کہ کانٹا منہ میں نہ پھنسے۔ سرور اپنی معصومیت اور مجبوری سے عزیز کے جال میں اٹک گیا تھا اور وہ میرے گرد بھی جالا بننا چاہتا تھا۔

اُسے علم نہیں تھا کہ اُس کی ٹکر اپنے ہی خون سے ہے۔

”میں دوں گا نہیں کچھ!“

میرا لہجہ قطعاً دوستانہ نہیں تھا۔

”آپ قرض کیسے چکائیں گے؟“

اُس کی بات تلخ تھی۔

”میں باہمی مشورے سے کوئی کاروبار قائم کر کے دوں گے لیکن اُسے تمہارے نام نہیں کروں گا۔“

عزیز کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔ غصے کی لکیریں مانوس لگیں اور مجھے اپنے اندر چاہت کی لہر اُٹھتی محسوس ہوئی۔

”میرے نام کیوں نہیں......“

سرور خود پر قابو پا چکا تھا۔ مجھے یہ تبدیلی پسند آئی۔

میرے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں تھی......

”اس لیے......“

میں دانستہ ہر لفظ علیٰحدہ علیٰحدہ کر کے عزیز کو سنا رہا تھا۔

”کہ تم تمام کاروبار کو لاپرواہی کی بھینٹ چڑھا دو گے۔ اپنے خاندان کے برعکس تمہیں محنت کرنے کی عادت نہیں۔“

”تو وہ کس کے نام ہو گا۔؟“

پہلی دفعہ اس کے لہجے میں بے یقینی کا عکس تھا۔

”میں اپنے نام ہی رکھ سکتا ہوں۔ تمہارے خاندان کے کسی فرد کو مالک بنا سکتا ہوں!“

”مثلاً......“

یہ اسے پسند نہیں آیا۔ اس کی بات میں برہمی نمایاں تھی۔

”کوئی بھی......سب سے مناسب تو تمہاری بھتیجی ہے!“

مجھے محسوس ہوا کہ عزیز کو یوں لگا جیسے میں نے اسے تھپڑ دے مارا ہو۔ وہ ایک قدم ایسے ہی پیچھے ہٹا کہ تھپڑ کے دباؤ نے اسے پرے دھکیل دیا ہو۔ یہ وقت تھا کہ میں اسے دبائے رکھوں اور میری زندگی کا طریقہ بھی یہی تھا۔

”یہ انہونی نہیں ہو گی۔ تم اسی کا لایا کھاتے ہو!“

اس نے پھر میری طرف دیکھا۔

ہماری نظریں ملیں۔

’’ہم پہلے کبھی ملے ہیں۔‘‘

مجھے اس کی نظروں میں تلاش اور پہچان کی کوشش نظر آئی۔

میں خاموش رہا۔

’’آپ جانے پہچانے نظر آتے ہیں!‘‘

ملاقات بہت مشکل مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔

جس طرح سرور اور عزیز ایک ماں کے بیٹے تھے اس طرح ہم دونوں کا باپ ایک تھا۔ اس حقیقت کو جان جانے کے بعد مجھے عزیز کے ردِعمل کا قطعاً علم نہیں تھا۔ ہر عمل ممکنات میں تھا۔ حملہ، قتل، انکار، اقرار...... کچھ بھی کہا جا سکتا تھا۔

میں خاموش رہا

مجھے حقیقت کے طلوع ہونے کے بعد اس کی سمجھ کے بہاؤ کے رخ کا انتظار تھا۔

’’آپ کون ہیں۔؟‘‘

اس دفعہ اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

’’تم جو سوچ رہے ہو وہ شاید درست ہے۔‘‘

حمیدی

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ٹانگیں عزیز کا وزن اُٹھانے سے قاصر ہیں۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا اور پھر مہلک زخم کھائے ہاتھی کی طرح آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔ ہاتھی جب اس طرح گر جائے تو بہت کم دوبارہ اُٹھتا ہے۔ جنگل کے بے شمار گوشت خور جانور اُسے نوچتے رہتے ہیں۔ مجھے عزیز کی حالت بھی ایسی ہی لگی...... میرے اندر پھر اس کے لیے پیار اور ہمدردی اُبل پڑے...... مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں ہم ایک باپ کی اولاد نہ ہوں اور وہ...... اس کے آگے کی سوچ کو میں نے شعوری طور پر ماننے سے انکار کر دیا۔

’’اٹھو۔‘‘

وہ دھیرے دھیرے اُٹھا۔ اُس کی نظریں اور سر جھکا ہوا تھا۔

’’مجھے منظور ہے۔‘‘

اُس کی آواز کسی بارانی علاقے کے کنوئیں کی گہرائی سے آئی۔

’’کیا؟‘‘

میں اسے باتوں میں الجھانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی سوچ اُگل سکے۔

’’جو بھی آپ کریں!‘‘

’’کیا میں کاروبار تمہاری بھتیجی کے نام کر دوں۔‘‘

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور میری طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے خالی تھیں۔

مجھے اس کی حالت سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اُس کا رشتوں پر سے اعتماد اُٹھ چکا تھا۔

’’میری تنگ دستی کے باوجود ماں میرے پاس رہی‘‘

اُس نے حقیقت قبول کر لی۔

’’شاید وہ مجھے بتانا چاہتی ہو یا چھپانے کے لیے یہ طریقہ نکالا ہو...... کچھ بھی سہی، اب کیا ہو سکتا ہے۔ کون میرا ہے میں نہیں جانتا...... ہاں! آپ کسی حد تک ضرور میرے ہیں۔‘‘

’’سب تمہارے ہیں...... رشتے بعض اوقات قرب سے بن کر دوری کے ہاتھوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ سب تمہارے ہیں۔‘‘

’’ممکن ہے...... مجھے تمام عمر ایک کرید رہی...... کسی خرابی کی جستجو۔ اَب معلوم ہو جانے کی صورت میں معاملات واضح ہو گئے ہیں...... کیا میں......‘‘

مجھے اُس کی بات کا ٹنا دانش مندی نظر آیا۔ اس کے اشارے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ عزیز اپنی پہچان کھو بیٹھا تھا۔

’’نہیں ایسا نہیں، سب تمہارے ہیں بلکہ ایک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تم نے ان رشتوں کو نبھانا ہے۔‘‘

’’آپ اگر ایسا ممکن سمجھتے ہیں تو درست ہو گا......‘‘

ہم نے طے کیا کہ عزیز کے لیے سینٹیری کا سامان تیار کرنے والی فیکٹری لگا دی جائے۔ وہ بضد تھا کہ کارخانہ اس کی بھتیجی کے نام ہو...... وہ بھی غالباً Reversal کے عمل میں تھا۔

VII

مجھے الیکشن میں بھاری اکثریت سے کامیابی ملی۔

عبدالمجید اور غفور نے میرے ساتھ رابطہ کیا اور اس کی وجہ مجھے معلوم تھی۔ وہ دونوں ہر طرح سے اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھے اور مجھے اپنا ہم خیال ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ انتخابی مہم کے آخری چند دن کافی تھکا دینے والے تھے۔ اُن دنوں میں اپنے تمام کاروباری معاملات سے دور رہا اور تمام وقت الیکشن کے لیے وقف تھا۔ جیتنے کے بعد میں کاروبار کی طرف متوجہ ہوا اور سیاست کو چند دنوں کے لیے پس پشت ڈال دیا۔

میرے علم میں نہیں تھا مگر انہیں دنوں مجھے آہستہ آہستہ اخباروں میں جگہ ملنے لگی، کسی نہ کسی حوالے سے۔ یہ ذکر اخباروں کے بعد ریڈیو پر آیا اور وہاں سے ٹی وی پر۔ میں اس عمل کے پس پردہ لوگوں کو جانتا تو تھا مگر ان کی رسائی وجۂ حیرت تھی۔ تاثر تو یہ تھا کہ انہیں کوئی جلدی نہیں اور وہ گھونگھے کی رفتار سے مقصد کو آگے بڑھاتے جائیں گے۔ مجھے اچانک لگا کہ وہ جلدی میں ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ میں دنوں میں مقامی سطح سے نکل کر قومی مقام حاصل کر لوں۔

مجھے یہ شہرت پسند بھی آئی۔

مجھے سرکاری پارٹی کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہر فیصلے کو قبول کرنا اخلاقی فرض تھا۔ پارٹی کی اعلیٰ قیادت میں شامل ہونے کی وجہ سے تمام اہم ملاقاتوں میں موجود ہوتا اور بوقت ضرورت اپنے مشورے یا رائے کا ضرور اظہار کرتا۔ میرے لیے اپنے گروپ کی ہدایات واضح تھیں کہ اگر ممکن ہو

تو میں ملک کے اعلیٰ ترین عہدے کے لیے در پردہ جدوجہد کروں اور یہ اس طرح کہ اپنے لیے کم سے کم مخالفین بناؤں۔

سیاسی حالات عبدالمجید کے تجزیے کے عین مطابق تھے۔ پارلیمانی نظام حکومت کو ختم کر کے ملک صدارتی طریقے سے چلایا جا رہا تھا۔ صدر کی اعانت کے لیے کابینہ موجود تھی مگر ان کے پاس اختیارات قطعاً نہیں تھے۔ بیوروکریٹس کا پرانا ٹولہ طاقت کا بروکر بنا ہوا تھا۔ ان کو مزید طاقت کا سہارا دینے کے لیے چند وزراء بین الاقوامی اداروں سے درآمد کر لیے گئے۔ ان کی سوچ قطعاً پاکستانی نہیں تھی۔ صدر بھی پاکستان کے معاشی حالات سے ناواقف تھے۔ وہ صرف جغرافیائی سیاست پر مبنی بین الاقوامی حالات سے واقف تھے۔ یہ واقفیت اُنہیں ملکی سرحدوں کے پار سیاسی سماجی اور معاشی حالات پر کافی حد تک دسترس مہیا کرتی لیکن ملکی حقائق جاننے کے لیے انہیں چیدہ چیدہ بیوروکریٹوں کا مرہون منت ہونا پڑا جن کے اپنے عزائم تھے۔

بظاہر ملک کی سیاست کے نقشے پر پارلیمانی نظام کی عمارت کے لیے جگہ کا تعین کر دیا گیا تھا لیکن اصل میں وہاں تعمیر کچھ اور ہونا تھا۔ صدر اپنے عہدے پر تاحیات براجمان رہنا چاہتے تھے، یہ کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ مشرقِ وسطیٰ میں کئی ملکوں میں ایسا ہے۔

وزیر اعظم کا انتخاب بہت اہم تھا۔ اس عہدے کے لیے صدر کو ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو بے داغ ہونے کے علاوہ کمزور ہو۔ اور در پردہ ایسی تلاش جاری تھی۔ مجھے بھی صدر نے ایک دفعہ پریذیڈنسی میں بلایا۔ ہم دونوں ملاقات میں اکیلے تھے۔ گفتگو کا آغاز میری صنعتوں اور ان سے متعلق دشواریوں سے ہوا اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سرمایہ کاری اور Industrilization پر تبادلۂ خیال کے بعد بات چیت کو چابک دستی سے سیاسی حالات کی طرف موڑ دیا گیا۔ صدر نے حالات کا بظاہر غیر جانبدار مگر نہایت جانبدار تجزیہ پیش کیا۔ ان کے مطابق کوئی اور حل ہو نہیں سکتا تھا۔ ملک میں سیاسی، معاشی اور فوجی استحکام تبھی ممکن ہوگا اگر وہ اپنی طویل المعیاد پالیسیوں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ انہوں نے ان منصوبوں کی مدت کا کوئی حتمی عرصہ نہیں دیا، یہ بیس سال بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں تھا سوائے اس کے کہ ملک پر ہر ایک کا حق

ہے۔ میں اپنی رائے کا قبل از وقت اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے خاموش رہا۔ صدر کے منصوبے وہی تھے جو ہر باشعور شہری کے ہوتے ہیں لیکن انہوں نے ان میں سے اپنی بقا ڈھونڈنا تھی۔

پری نے مجھے آنکھوں کے تاثر پڑھنے سکھائے تھے۔ صدر کے ساتھ میری ملاقات کافی دلچسپ رہی۔ مجھے ان کی باتوں کے کھوکھلے پن کے ساتھ تاثرات کی حقیقت کو پہچاننا تھا۔ اُن کی گفتگو کو غور سے سننے کے علاوہ میری نظر ان کے چہرے پر بھی تھی۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ ہر تاثر کا پھول سوچ میں جنم لینے کے بعد آنکھوں میں کھلتا ہے۔ صدر اور میں جب محوِ گفتگو تھے اس وقت ان کی آواز اور آنکھوں کے تاثرات میں واضح فرق تھا۔ لہجہ موضوع کا بھاری پن لیے تھا مگر آنکھیں ہر جذبے سے عاری تھیں بلکہ وہ نظر اُٹھا کر بات کرنے سے کترا رہے تھے۔ صدر یہ نہیں چھپا سکے کہ وہ خود اپنے دلائل سے متفق نہیں۔ طاقت کے تمام ذریعے ان کے اختیار میں تھے یہاں تک کہ عدالتیں قانون اور نظریۂ مجبوری کے درمیان سمجھوتہ کر کے انہیں جائز اور حق بجانب گردان چکی تھیں۔

صدر نے مختلف لوگوں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں ایک خودمختار ذہن کا مالک ہوں۔ وہ غالباً وزیر اعظم کے عہدہ کے لیے آرا اکٹھی کر رہے تھے۔ میری رائے جانبدار تھی کہ میں اس نظام کے خلاف سرگرمِ عمل تھا۔ مجھے جس بھی شخص کے بارے میں پوچھا گیا، میرا جواب وہی تھا جو مختلف ادارے پریس کو مہیا کر رہے تھے بلکہ دوسرے الفاظ میں میں ایک جانبدار تجزیے کی تائید کر رہا تھا اور غالباً صدر کو اسی کی ضرورت تھی۔ ملاقات کے اختتام سے پہلے صدر نے مجھے مشورہ دیا کہ ان سے ملتا رہوں۔

حزبِ اختلاف کو پہلے ختم کرنے اور بعد میں غیر موثر بنانے کی کوشش شروع ہوگئیں ء۔ حکمران جماعت دو حصوں میں بٹ گئی جس کی وجہ پارٹی کے اپنے بنیادی ممبران اور مواقع کی تلاش میں آئے عوامی نمائندوں کے درمیان مفادات کی جنگ تھی۔ باہر سے آنے والے لوگ لوٹ میں زیادہ کے متقاضی تھے جب کہ پرانے نمائندے اپنی اہمیت میں کمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مختلف خیالات کے لوگوں کو اکٹھا رکھنا اتنا آسان نہیں اور حکومت کے پاس اس کا نسخہ پہلے سے موجود تھا۔ پیشتر ممبران کسی نہ کسی طرح قابلِ گرفت تھے اور ان تمام کے خلاف تعطل کا شکار کارروائیوں کو جاری کرنے کے

احکام صادر ہوگئے۔ نتیجتاً وہ بے بس اور وفادار ہوگئے۔

صدر اپنی ٹیم کے ساتھ مل کے بحران کو حل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور جس وزیر اعظم کی تلاش تھی انہیں وہ مل گیا۔ پہلے والوں کی طرح وہ سادہ، ایماندار اور کمزور آدمی تھا اور یہی صدر کو مطلق العنان رکھنے کا بنیادی طریقہ گردانا گیا۔ وزیر اعظم کی تعریف میں ابلاغ کا ہر ذریعہ مصروفِ عمل ہوگیا اور ثابت کی جانے لگا کہ ملک کو کبھی بھی موزوں سربراہ حکومت نہیں ملا تھا۔

آئین معطل کر دیا گیا تھا اور حکومت نے پارلیمنٹ سے اس کے تعطل کے حق میں بل منظور کروا لیا۔ جزب اختلاف کا احتجاج حکومتی اداروں کی طاقت تلے دب گیا۔ صدر ملکی حالات پر حاوی ہوگئے اور ملک بادل نخواسہ ان کے منصوبوں کے حصول میں نکلا۔ جب یہ عمل جاری تھا تو سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار میں ایک غیر اہم سا مضمون چھپا جس کا مقصد موجودہ سیاسی نظام کے ناکارہ پن کو منظر عام پر لانا تھا۔ مجھے اس مضمون کے اشاعت کے وقت پر حیرت نہیں ہوئی۔ یہ تجزیہ کافی دن موضوع بحث رہا۔ اور حکومت نے اسے بہت اچھالا کیوں کہ یہ کافی حد تک صدر کے نظریۂ طاقت کے قریب تھا، صرف طریقہ حصول مختلف تھا۔

کابینہ تشکیل دی گئی اور تمام اہم ممبروں کو کسی نہ کسی طرح وزارتوں میں کھپایا گیا۔ مجھے وزارت داخلہ کی ٹاسک فورس میں محکمہ پاسپورٹ کا نگران مقرر کیا گیا۔ امریکہ میں ٹون ٹاورز کی تباہی کے بعد یہ محکمہ بہت اہم ہوگیا تھا اور ہر وقت اگلے چند سالوں میں جاری کردہ پاسپورٹوں کی تلاش یا تصدیق ہوتی رہتی۔ اسی طرح نئے پاسپورٹوں کے اجرا میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ مجھے ہدایات تھیں کہ اِس غیر اہم محکمے میں اپنی اہلیت ثابت کروں۔ اس سلسلے میں وزیرِ داخلہ سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ روزانہ ملک میں جاری ہونے والے پاسپورٹوں کی میں ایف آئی اے سے تصدیق کراتا اور بعض اوقات ایسے لوگ پکڑے جاتے جو جعلی نام اختیار کیے تھے یا جن کی حکومت نگرانی کر رہی تھی۔ وزیرِ داخلہ کو یہ پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں کا اختلاف اتنا بڑھ گیا۔ کہ ایک دن قومی اسمبلی کے اجلاس میں، میں تمام حقائق کھولنے پر مجبور ہوگیا۔ وزیرِ داخلہ نے سو کے قریب جعلی پاسپورٹ بنوائے تھے۔

امریکہ میں ہوائی حملوں کے بعد دنیا میں ایک اور نظریہ زیر بحث آ گیا۔ چند ملکوں میں ہر چیز دہشت گردی کو ہوا دیتی ظاہر کی گئی جب کہ کچھ ممالک کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ دہشت گردی کے خلاف

جنگ میں ہمارے ملک کا کردار نمایاں تھا مگر یہ جمع تفریق تک ہی رہا کیوں کہ ہر سطح پر صدر عالمی حکومتوں اور اداروں کو یقین دلانے کی کوشش میں رہے کہ ہمارا ملک کسی قسم کی دہشت گردی میں شریک نہیں۔ المیہ یہ تھا کہ اسے حقیقت تسلیم نہیں کیا گیا۔ صدر نے اس مسئلے کو ٹھوس طریقے سے نمٹانے کے بجائے ذاتی بقا کا ذریعہ رکھا۔

کبھی کبھار کسی اخبار میں نظریۂ پول کے حق میں مضمون چھپ جاتا۔ شروع میں اس سوچ کو جمہوریت اور عالمی فکر کے منافی سمجھا گیا۔ لوگوں کا ردِعمل کافی جارحانہ تھا۔ بتدریج یہ خیال لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھنا شروع ہو گیا اور ایک مختصر عرصے کے بعد اس کی مخالفت بند ہو گئی لیکن موافقت میں کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ شاید سب خائف تھے۔

صدر نے اپنے دورِ حکومت کے لیے کوئی معیاد مقرر نہیں کی تھی جس کی وجہ سے حزبِ اختلاف کا ان کے خلاف رویہ غیر مصالحانہ تھا۔ یہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے مگر ان کی آواز موثر بنتی جا رہی تھی۔ صدر نے وزیرِاعظم کو ذمے داری سونپی کہ وہ مذاکرات کو اتنا طول دے کر یہ تحریک اپنی موت خود مر جائے۔ یہاں صدر اور ان کے اداروں کا تجزیہ غلط تھا یا انہیں جان بوجھ کر ایسی اطلاعات فراہم کی گئیں جن سے وہ آرام سے ہو گئے۔ وزیرِاعظم اتنا کمزور آدمی تھا کہ مضبوط کرسی بھی اسے طاقت نہ دے سکی۔ اس کی مذاکراتی ٹیم میں مجھے بھی شامل کیا گیا۔ ان دنوں تقریباً روزانہ ہمارے مخالف فریق سے مذاکرات ہوتے۔ وہ لوگ بہت شاطر اور معاملہ فہم تھے۔ وزیرِاعظم کی تعقلی سطح دیکھ کر مجھے پچھلے صدر اور ان کا حلقۂ احباب یاد آ جاتا۔

جو لوگ سیاست میں میرے رفقا تھے، میں اکثر ان کے تعقل پر حیران ہوتا۔ نہ وہ کسی قومی یا بین الاقوامی سیاسی مسئلے کو صحیح تناظر میں دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی ان میں اس کا تنقیدی تجزیہ کرنے کی اہلیت تھی۔ الیکشن میں میرے مخالف بدرالدین کی طرح وہ تمام دولت، طاقت اور دھونس کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچے تھے۔ سجادہ نشینوں کی طرح ان کی گدیاں تھیں، وہ نسل در نسل منتخب ہو رہے تھے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کسی سیاسی جماعت یا نظریے سے وابستگی نہیں۔ میرے اردگرد اکثریت فیوڈل طبقے کے نمائندوں کی تھی۔ ان کی سیاست کا محور طاقت تھا اور وہ ہر ممکنہ ذریعہ سے اس کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے تھے۔ اکثریت نامور بیرونی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر چکی تھی مگر ان کی سوچ صدیوں پرانی تھی۔ ان کے نزدیک آج بھی انسانیت کے دو حصے تھے یعنی زمینوں کے مالک اور

بے مالک۔ وقت کے ساتھ اس نے بٹ کر کم ہونا ہے چناں چہ وہ متوازی خطوط پر چلتے صنعت کے میدان میں بھی آ گئے۔ بطور صنعت کار وہ آزاد خیال اور فراخ دل ہیں لیکن اپنے آبائی علاقوں میں اُن کی فیوڈل سوچ تبدیل نہیں ہوئی۔ وزیرِ مواصلات تمام ملک میں سڑکوں کا جال پھیلانے کا سوچے گا مگر اس کی کوشش ہو گی کہ اپنے حلقۂ انتخاب میں صرف پکی انیٹوں کے راستے بنیں تا کہ صنعتی سوچ جتنی دور رہ سکے بہتر ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو جمہوریت کے نازک پودے کی جڑوں میں دیمک بن گئے اور انہیں کے خلاف عبدالمجید برسرِپیکار ہے۔

صدر کے عہدے کے دورانیہ پر حزبِ اختلاف اور ہماری مذاکراتی ٹیم کے درمیان میں گفتگو چلتی رہی۔ دونوں فریق جب بھی ملتے ایک دوسرے سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنے کے علاوہ ذاتی نوعیت کے مسائل پر بھی تبادلۂ خیال کرتے، بعض اوقات وزیرِاعظم کو کہا جاتا کہ جب تک فائدہ اُٹھایا جائے، اُٹھانا چاہیے۔ مجھے اس رویے پر حیرت ہوتی۔ ملاقات کے بعد دونوں جماعتوں میں جاسوس موجود ہیں، یہ ڈبل کراس کرنے والے لوگ اکثر فیوڈل تھے۔

ایک طویل عرصہ یہ مذاکرات اِسی طرح جاری رہے اور پھر ایک دن دونوں فریقوں نے اعلان کر دیا کہ گفتگو مزید جاری رکھنا حماقت ہے۔ حکومت کے نمائندوں کے پاس جواز تھا کہ انہیں پارلیمنٹ کی حمایت ہے جب کہ حزبِ اختلاف نے اعلان کیا کہ وہ لوگوں کے پاس جا کر عوامی تحریک چلائیں گے۔

صدر نے ایک دن حکومت برخواست کر کے نئی صدارتی کابینہ تشکیل دی اور ان تمام عوامل کی قانونی حیثیت رکھنے کے لیے اسمبلی نہیں توڑی بلکہ اجلاس کی تاریخ بھی دے دی۔ مجھے وزارتِ داخلہ کی ٹاسک فورس کا سربراہ بنا دیا گیا اور پاسپورٹ کے علاوہ ایف آئی اے، پولیس اور دیگر کئی محکمے میرے ماتحت ہو گئے۔ میں اپنا فیصلہ کر چکا تھا اور اس پر عمل درآمد سے مجھے فوری فوائد حاصل ہوتے تھے۔

پارلیمنٹ کے اجلاس سے ایک دن پہلے میں نے کوئی وجہ بتائے بغیر اپنی نشست سے استعفیٰ دے دیا۔ مجھے استعفیٰ واپس لینے کے لیے لالچ اور کئی دباؤ ڈالے گئے، پیش کشوں میں اسمبلی کی سپیکر شپ بھی تھی۔

میں کوئی جواب دیے بغیر اپنے کاروبار کو لوٹ آیا۔

ملکی سیاست اپنی مخصوص چال سے تباہی کی طرف رواں تھی اور ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق اسی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہماری یہی خواہش تھی۔ عبدالمجید سے میری ملاقات نہیں ہوئی لیکن میں اسے بند آنکھیں کیے شرارت سے مسکراتے دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی آزاد خیال سیاست دان نظریہ پول کے حق میں بیان دے دیتا یا کسی تجزیہ نگار کا مضمون نظر سے گزرتا۔ مجھے ہم خیال لوگوں کی پہچان ہونے لگ گئی تھی۔ یہ تعداد میں زیادہ نہیں تھے مگر ہر ایک کا منفرد مقام تھا۔ مجھے خود کو ان میں شامل دیکھ کر خوشی بھی ہوئی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ عبدالمجید کی یہ سوچ ایک نظریے میں ڈھل کر مختلف طبقات میں دلچسپی کا باعث بن رہی تھی۔ ایک آدھ موقع پرست سیاست دان نے حق میں بات کی لیکن میرے خیال میں کوئی گروہ اس سوچ کی گہرائی جاننا چاہتا تھا۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ملک کا اہم ترین ادارہ نظریے کے ماخذ تک پہنچ گیا ہو اور وہ اسے صدر کے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔ مجھے بھی ایک دفعہ ناپختہ خیالات والے دو آدمی اخباری نمائندے بن کر ملے اور اس نظریے پر میرے خیالات جاننا چاہے۔ میرا جواب بالکل واضح اور دوٹوک تھا کہ ملک کو Chronic سیاسی بحران سے نکالنے کا یہی واحد حل ہے۔

ایک دن پیغام ملا کہ عبدالمجید بیمار ہے اور وہ مجھے ملنا چاہتا ہے۔

وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال کے انتہائی نگہداشت والے کمرے میں تھا۔ غفور بھی کمرے میں موجود تھا۔ اُسے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور تنفس میں دشواری واضح تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ میں خاموشی سے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے سرہانے سگریٹ کی تین ڈبیاں اور ایک لائٹر رکھا تھا۔

اُس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ۔

اُسے اس کیفیت میں دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جسے انسان ہمیشہ زندگی کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔ بیماری کے قطع نظر وہ ہمیشہ کی طرح شاید بند آنکھوں سے میرے جذبات سمجھ رہا تھا۔

اُس کے ہونٹ ہلے۔

میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ بہت کوشش کے بعد ایک تھکی ہوئی سرگوشی اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

''سگریٹ چھوڑے تو زندگی نے مجھے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔''

عبدالمجید کی آواز بمشکل مجھ تک پہنچی۔

میرے سگریٹوں کی طرف دیکھنے پر اس کا سر نفی میں ہلا۔

''عادت۔''

اس کی آنکھیں بند تھیں مگر مجھے اس کا قہقہہ سنائی دے رہا تھا۔

عبدالمجید کا پیٹ ایسے ہل رہا تھا جیسے بچہ غبارے میں ہوا بھر رہا ہو۔

''وقت کم ہے۔''

اس دفعہ عبدالمجید کی آواز صاف تھی، غالباً اس کے نظام نے یک جا ہو کر جسمانی صلاحیتوں کو عارضی طاقت دے دی تھی۔

''آپ نے اپنی ذمے داریاں بہت اچھی نبھائیں!''

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ آہستہ سے سرکتا سگریٹ کی ڈبیوں کے اُوپر پہنچ کر رکا۔

''موجودہ صدر کا ہمارے نظریے کو استعمال کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے بہت واضح اشارے موجود ہیں۔ میں کوئی فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ آپ سے رابطہ کیا جائے گا۔''

وہ نڈھال ہو کے خاموش ہو گیا۔ بچہ غبارے میں ہوا بھرنے کے عمل میں مصروف تھا۔

''نظریے ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ افراد کی موت انہیں روک نہیں سکتی۔ میرے بعد یہ سوچ مزید پھلنی پھولنی چاہیے۔ آپ پرچم برداروں میں سے ایک ہیں……!!''

عبدالمجید کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک کونے میں لگے مانیٹروں پر لکیریں آڑی ترچھی ہو گئیں۔ اُس کے گلے سے سانس کی آواز ایسے نکل رہی تھی جیسے کوئی انگلیوں سے گلہ دبا رہا ہو۔ غفور نے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر اور نرسیں کمرے میں موت کے سایوں کی طرح کھڑے تھے۔

اگلے دن عبدالمجید فوت ہو گیا۔

اُس کا نظریہ آج بھی زندہ ہے……

VIII

رخشندہ اور میں جب دور ہوئے تو اکٹھے نہیں ہو سکے۔

میری چند موقعوں پر بے دلی کی سی کوششوں کو رخشندہ نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اُس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے گھر گئی اور نہ ہی طلاق چاہی۔ ہم دونوں ایک گھر میں رہتے ہوئے ساتھ نہیں تھے۔ شروع میں اسے اُمید تھی کہ میں شاید اپنی مایوسی سے سمجھوتہ کر کے واپس آ جاؤں مگر مجھے دوسری دلچسپیاں اپنی ریشمی ردا میں چھپانے لگیں اور میں ان وادیوں میں گم ہو گیا جہاں سایہ بھی ساتھ نہیں ہوتا۔ رخشندہ گھر کے معمول کے معاملات میں اُلجھی رہی اور میں وہاں بھی اُسے زچ کرتا۔ گھر کی ہر ترتیب مجھے ناپسند تھی اور میں اس کا برملا اظہار کرتا۔ مجھے اس کے چہرے پر برہمی کا ایک ایک لفظ نظر آتا مگر میں انہیں پڑھنے کی کوشش ہی نہ کرتا۔ میرے اندر نفرت سرایت کر چکی تھی۔ وہ میرے رویے سے پریشان نہیں ہوئی اور کئی برس منتظر رہی ...... اور پھر ...... ہم اکٹھے نہیں ہو سکے۔

وہ گھر کے معمولات سے دور ہونا شروع ہو گئی۔ میں جان نہیں سکا کہ کب ...... مگر وہ زندگی کی کسی منزل میں مذہب کی طرف مائل ہو گئی۔ مجھے اس چیز کا بخوبی علم تھا کہ یہ ایک گہرا نفسیاتی ردِعمل ہے۔ مذہب کی طرف انسان کی رغبت دو وجوہات کی وجہ سے ہوتی ہے، یا تو وہ کسی موڑ پر حقیقت کو جاننے کے لیے یہ تجربہ بھی کر گزرنا چاہتا ہے اور یا پھر مایوسی کی تہہ در تہہ تاریکی کو پھاڑنے کے لیے مذہب کی روشنی چاہیے ہوتی ہے۔

وہ زیادہ وقت نوافل ادا کرتے یا تسبیح پر ورد کرتے گزارتی۔ گناہ اور ثواب کے درمیان جنگ اس کی سوچ کا میدان بن گئی۔ گلاس بائیں ہاتھ سے پکڑنا گناہ تھا تو ہر کام کے آغاز سے پیشتر بسم اللہ پڑھ لینا عین ثواب۔ اسے میرا کوٹ پتلون پہننا ناپسند تھا اور میرا داڑھی نہ رکھنا گناہ۔ اس طرح کے کئی مسائل تھے جو ہر وقت اُس کے ذہن کو اُلجھائے رکھتے۔ مجھے علم نہیں کہ وہ حقیقت میں رہتے ہوئے خواب دیکھ رہی تھی یا خواب میں ہوتے ہوئے سچ کی متلاشی ...... میں اسے اگر کوئی چیز تھماتا تو وہ اسے رکھ کر فوراً ہاتھ دھو کر آتی کہ پلید ہو گئے تھے۔

وہ صبح اور شام سیر کیا کرتی تھی۔ اس ورزش نے بہت عرصہ اسے صحت مند رکھا۔ اس کے گال ہمیشہ گلابی رہے۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ یہ وقت ضائع کر رہی ہے اور اسے بھی عبادت کے تصرف میں لے آئی۔

وہ میرے سمیت گھر کے معمولات سے بھی دور ہو گئی۔ صبح و شام وہ تلاوت اور نمازوں میں مصروف رہتی۔

وہ ایک چھوٹے قد کی عورت تھی۔ کسی وقت جب دونوں اکٹھے گھوما کرتے تھے تو اسی وجہ سے ہم ایک منفرد جوڑا تھے۔ میرا قد کافی اُونچا ہے اور رخشندہ کا کافی چھوٹا تھا۔ رخشندہ شروع ہی سے کھانے کا لطف لیا کرتی تھی اور اس کا یہ شوق برقرار رہا۔ ورزش چھوڑنے کے بعد اس کا وزن بڑھنا شروع ہو گیا اور ایک وقت آیا کہ وہ گوشت پوست کا پہاڑ بن گئی۔ گو ہمارے درمیان کسی بھی قسم کا رشتہ نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اسے کبھی مکمل عورت کی شکل میں دیکھا مگر پھر بھی وہ پرکشش تھی۔ چند برسوں کے بعد وہ اپنی کشش کھونے لگی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی دوبھر ہو گیا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس کی صحت گرنا شروع ہوئی۔

اس نے کبھی شکایت نہیں کی یا ممکن ہے اسے علم ہی نہ ہو مگر اس گوشت پوست کے پہاڑ کے اندر نظر نہ آنے والی تبدیلیاں شروع ہو گئیں۔ عرصہ پہلے اسے اپنے نظام سے ایک السر نکلوانا پڑا تھا۔ وہ السر تو نکل گیا مگر ساتھ ہی رخشندہ کی زندگی کو بھی بانجھ کر گیا۔ بظاہر غیر ضروری وجود اس

کے جسم سے نکالا جا چکا تھا مگر وہ اخراج سے پہلے اپنا کوئی حصہ وہیں کہیں، اُرد گرد، چھوڑ گیا۔ وہ حصہ خائف تھا اس لیے کسی کونے میں پڑا سویا رہا۔ وہ رخشندہ کی زندگی کے اہم ترین رس کو خشک کر گیا تھا لیکن اسے اس سے بھی چین نہ آیا۔

جب اس نے سوچا کہ رخشندہ اب اسے مکمل طور پر بھول چکی ہے تو وہ ایک انگڑائی لے کر اُٹھا۔ اس کی پہلی انگڑائی نے ہی رخشندہ کو بے چین کر دیا۔ اس کے پیٹ میں ہلکا سا درد رہنے لگا تو رخشندہ نے ڈاکٹر کو بلایا جس نے بسیار خوری کو وجہ ٹھہراتے ہوئے دوائی تجویز کی۔ رخشندہ نے وہ دوائی لینا شروع کر دی اور نظام کے اندر چھپا دشمن چند دنوں کے لیے کہیں پیچھے چھپ گیا۔ جب درد مکمل طور پر ختم ہو گیا تو رخشندہ نے دوائی کا استعمال بند کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد اسے مثانہ سے تھوڑا اُوپر کی طرف درد محسوس ہوا جسے اس نے کوئی اہمیت نہ دی اور جلد ہی اس درد کا نام و نشان مٹ گیا۔ مگر بعد میں یہ ایک معمول بن گیا۔ رخشندہ نے اپنی خوراک کم کر دی مگر درد کا وہی قاعدہ رہا۔ اس نے مجھے اعتماد میں نہیں لیا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ ہر جذبے کی طرح اس تکلیف کو بھی نظر انداز کر دوں گا۔

ایک شام ڈاکٹر اور میں اکٹھے گھر پہنچے۔ مجھے ڈاکٹر کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی کہ رخشندہ اور میں دونوں صحت مند تھے اور ڈاکٹر کے ساتھ میرے مراسم ذاتی نوعیت کے نہیں تھے۔

’’بیگم صاحبہ کو کچھ دنوں سے پیٹ میں Dull سا درد ہے۔ میرے خیال میں بہتر ہے کہ ہم ٹیسٹ کروالیں تا کہ Precise علاج ہو سکے۔‘‘

رخشندہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔

میں خاموش بیٹھا رہا کیوں کہ کسی قسم کی رائے کا اظہار شاید ہمارے تعلقات کی طرف اشارہ کر دیتا۔ تھوڑی دیر بعد رخشندہ بھی آ گئی۔ اس کے وزن میں ایسی کمی نہیں تھی جو تکلیف کی شدت ظاہر کرتی مگر وہ صحت مند نظر نہیں آئی۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ یہ کم نیند کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

صوفے پر بیٹھ کر اس نے لمبا سانس لیا۔

ڈاکٹر نے رخشندہ کی حرارت دیکھنے کے بعد اس کی چھاتی اور کمر کو ٹوٹی لگا کر دیکھا۔ اس کاروائی کے بعد اس نے رخشندہ کو صوفے پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے آہستہ آہستہ پیٹ کو ٹوہنے لگا۔

میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔

ایک مقام پر رخشندہ نے کہا۔

’’یہاں!‘‘

ڈاکٹر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس ردِ عمل کی سمجھ نہیں آئی۔

’’یہاں؟‘‘

ڈاکٹر کا ہاتھ نیچے کر سرک گیا تھا

’’کچھ کم!‘‘

’’یہاں؟‘‘

’’نہیں‘‘

رخشندہ مسکرائی۔

ڈاکٹر درد والے مقام سے دائیں طرف چلا۔

’’یہاں‘‘

’’ہلکا سا‘‘

ڈاکٹر کا ہاتھ مزید باہر کی طرف گیا۔

’’نہیں‘‘

یہی عمل بائیں طرف دہرایا گیا۔

ڈاکٹر درد کی جگہ کا تعین کرنے کے بعد اسے کافی دیر تک ٹٹولتا رہا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک مخصوص مقام پر رخشندہ کے چہرے پر تکلیف کا سایہ آ جاتا۔

’’پیٹ میں Growth ہے۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ اور کچھ دوسرے ٹیسٹ ہیں۔‘‘

’’نتائج آنے پر متعلقہ سپیشلسٹ سے رجوع کریں گے۔‘‘

ڈاکٹر نظر جھکائے اپنے پیڈ پر لکھے جا رہا تھا۔

وہ صحیح پیشہ ور تھا۔ اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

پورچ میں جانے سے پہلے ڈاکٹر نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا...... ممکن ہے تشخیص خوشگوار نہ ہو''

میں جب لاؤنج میں پہنچا تو پریشان تھا۔ رخشندہ اسی صوفے پر بیٹھی تھی۔ میں کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر اچانک میرے اندر اس کے لیے ہمدردی واضح حقیقت کی ایک لہر بن کر آنکھوں سے باہر آنے کے راستے ڈھونڈنے لگی۔ ہماری نظریں ملیں تو وہ میرے جذبے کی تاب نہ لاتے ہوئے رو پڑی۔ میں اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔

اتنے بڑے گھر میں ہم دونوں پچھلے پینتیس برس سے اکٹھے رہ رہے تھے۔

ہم شاید ایک دوسرے کی موجودگی سے اتنا بے خبر رہے کہ گھر میں ہر جذبے کی اہمیت سے لاتعلق ہو گئے۔ رخشندہ کے پیٹ کا درد یک دم ہمارا مشترک دشمن بن کر بیچ میں آ کھڑا ہوا۔ وہ میرے مقابلے میں ہمیشہ ڈٹ کر رہی اور کبھی بھی اپنے بارے مجھے کسی قسم کی صفائی پیش کرنا غیر ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر کے لہجے اور اطوار نے اس کی ہمت کے بند میں شگاف ڈال دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

میں قالین پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

اس کے آنسوؤں کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی تو اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

یہ ایسے ہی تھا جیسے بارش کے بعد مطلع صاف ہوتے ہی قوس قزح بکھر جائے۔

مجھے لگا ہم بہت ہی قریب آ گئے ہیں۔

''تم روئی کیوں؟''

''مجھے اپنی بیماری کی نوعیت کے بارے میں علم نہیں، اتنا جانتی ہوں کہ میرے پیٹ میں کچھ ہے اور یہی میرا دشمن ہے۔''

اس کے لہجے میں درد تھا۔ میری نظریں جھکنے کو تھیں کہ مجھے خیال آیا کہ اس وقت ندامت چھپانے کے بجائے اخلاقی طاقت کے مظاہرے کی ضرورت ہے۔

وہ میرا چہرہ پڑھ رہی تھی۔

''کچھ دشمن انفرادی ہوتے ہیں، اگر یہ دشمن نکلا......''

اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے میں ہنسا۔

''تو اجتماعی ہو گا۔ تمہیں پتا ہے کہ دشمن کو شکست دیتے ہیں اور میں دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

''مجھ سے بہتر کوئی نہیں سمجھتا۔''

اُس نے ایک لمبا سانس لیا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

رخشندہ کی ٹیسٹ رپورٹوں میں معدے کے اندر کینسر کی موجودگی کی تصدیق تھی۔

ہم ایک طویل جنگ میں مبتلا ہو گئے۔ میرے پاس مقابلہ کرنے کے تمام ذرائع اور اوزار تھے۔ ہمارا دشمن رخشندہ کے پیٹ کے اندر ایسی اہمیت کی جگہ جا بیٹھا جہاں سے اس کا انخلا مشکل تھا۔ آپریشن کے ذریعے اس ٹیومر کو نکال کر اسے بائیوسکوپی کے لیے بھیجا گیا۔

ٹیومر Malignant تھا۔

رخشندہ کے جسم نے علاج کا مثبت جواب دیا اور وہ دس دنوں میں صحت یاب ہو کر گھر آ گئی۔ میں دن کا کچھ حصہ اس کے ساتھ گزارتا۔ وہ اگر عبادت میں مصروف ہوتی تو انتظار میں بیٹھا رہتا اور پھر دونوں ٹہلتے ضرور۔ ہفتے میں دو دفعہ رخشندہ کو ٹیسٹوں کے لیے ہسپتال جانا ہوتا۔

تین ہفتوں کے بعد اس کے بائیں والے گردے پر ایک چھوٹا سا دھبہ نمودار ہوا۔ ڈاکٹروں کی ٹیم نے اسے اختتام کا آغاز بتایا۔ اسی دن رخشندہ کی کیموتھراپی شروع ہو گئی۔ یہ بہت ہی تکلیف دہ پروسیجر تھا۔ وہ سارا وقت قے کی کیفیت میں رہتی اور سر چکراتا۔ اس کے بال گرنا شروع ہو گئے۔ پلکیں، بھنویں اور سر خالی ہو گیا۔ وہ بیہوشی کی حالت میں سوئی رہتی۔ کیموتھراپی چھوٹے سے دھبے کو پھیلنے سے نہ روک سکی، اُس کا پھیلاؤ تیز نہیں تھا مگر آہستہ آہستہ وہ جسامت میں بڑا ہوتا گیا اور پھر اچانک مزید پھیلنے سے رک گیا۔ چند روز اس اُمید پر گزرے کہ شاید کیموتھراپی کامیاب ہونا شروع ہو گئی ہے بلکہ ایک دن اس کی جسامت میں کمی واقع ہوئی۔ پھر ایک

دن ویسا ہی معصوم سا سایہ اس کے چہرے پر نظر آیا۔ کیموتھراپی کا تکلیف دہ پروسیجر دوبارہ شروع ہو گیا۔

رخشندہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے وزن کے کم ہونے کی رفتار تیز تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کے رہ گئی۔ اس کی آواز تک گلے سے باہر نہیں آ سکتی تھی، صرف آنکھون میں زندگی تھی۔ وہ لوگوں کو چلتے پھرتے خاموش نظروں سے دیکھتی رہتی۔ وہ کیا سوچتی، کسی کو علم نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بھائی اور بہنوں کو اطلاع نہ دی جائے۔ ایک وقت آیا کہ میں نے یہ مناسب نہ سمجھا اور اس کے خاندان کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ اور وہ تمام میرے گھر میں آ گئے۔ وہ سب اور میں رخشندہ کی زندگی کے آخری ایام میں شریک ہونے کی کوشش میں تھے۔ ان دنوں گھر میں پہلی دفعہ رونق نظر آئی، عجیب بات تھی۔ یہ سالہا سال سے اندھیرے میں رہا تھا، ان دنوں سے جب میرے والدین یہاں آباد تھے۔ رخشندہ کی زندگی کے آخری ایام میں تمام کمروں میں قمقمے جل اُٹھے۔ کوئی نہ کوئی گھر سے نکل یا داخل ہو رہا ہوتا اور بعض اوقات اتنے بھاری ماحول کو ہلکے سے قہقہے کی آواز جادوئی رنگ دے جاتی۔

رخشندہ کا نظام بتدریج ناکام ہو رہا تھا۔ اسے یرقان ہوا، نمونیا اور پھر وہ کومے میں چلی گئی، ایک دن اس کے پیٹ میں دبکا ہوا دشمن جیت کر اسے ختم کر گیا۔ رخشندہ کی تمام زندگی ایک ناکام مقصد کے حصول میں گزری۔ اس سے کوئی مفاد اٹھا سکا اور نہ کسی کو نقصان ہوا۔ وہ اکیلے زندہ رہی اور کسی سے کوئی معاملہ کیے بغیر فوت ہو گئی۔

مجھے اسے بھی کچھ لوٹانا تھا۔

کئی ہفتے مختلف منصوبوں کے متعلق سوچنے کے بعد یہ طے کیا کہ میں تمام شہروں میں کینسر کے مریضوں کے تشخیصی نمونوں کو اکٹھا کر کے بہترین لیباٹریوں کو مفت ارسال کرنے کے مراکز قائم کروں گا۔ اس کام کے لیے بھاری سرمایہ اور ذرائع کی ضرورت تھی۔ بہت عرصہ پہلے میں حکومت کو واجب الادا سرمائے کا تخمینہ لگوا چکا تھا۔ یہ کثیر رقم تب ہی علیحدہ کر دی گئی تھی اور اس میں اضافہ ہوتا رہا تھا۔

میں منظم طریقے سے ان مراکز کو قائم کرنے کے عمل میں مصروف ہو گیا۔

IX

مجھے کوئی جسمانی عارضہ نہیں تھا مگر ٹانگیں میرا بوجھ نہیں اُٹھا رہی تھیں!!

میں یادوں کی ناہموار گلیوں میں بھٹکتا اپنے سر سے قرضوں کا بوجھ اُتار کر آگے بڑھنے کے لیے کوشاں رہا۔ مجھے ابھی کئی کام نمٹانا تھے اور یہ بھی نہیں کہ وقت میرے ساتھ نہیں تھا۔ میں بالکل تنہا ہونے کے باوجود اپنے آپ میں مگن ہو گیا، یہاں تک کہ بے شمار چیزیں اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ میرا فرزندِ قربان سے رشتہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ہمارے درمیان کسی اختلاف نے اپنا وجود کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دلچسپیاں مختلف ہو گئیں تھی۔ اسے اپنے خاندان کی چھوٹی اور غیر اہم باتیں بہت دلچسپ اور ضروری نظر آتیں جب کہ مجھے پری، رخشندہ، عبدالمجید، باپ، دادا، پردادا، عبدالنبی اور بنک کیشئر ہمیشہ راستہ روکے کھڑے نظر آتے۔ میں اکثر سوچتا کہ ان تمام لوگوں نے اپنے پتے اور داؤ پیچ کھیل کر مجھے یہاں پہنچایا ہے۔ یہ چھوٹی سی سلطنت تقریباً ایک صدی میں کھڑی ہوئی، اور کیا میں جانے سے پہلے اُجاڑ دوں۔ دونوں ہی کام آسان نہیں۔ بناتے ہوئے اگر نسلیں سالہا سال صرف کرتی ہیں تو اُجاڑنے کے لیے بہت بڑا حوصلہ اور یقیناً وہ مجھ میں نہیں تھا۔ جو سلطنت میرے حصے میں آئی اسے گرنے سے بچانا میرا فرض ہے اور میں فرائض کی ادائی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا۔

میں آگے بڑھتا رہا۔

مجھے کیشیئر کی تلاش تھی۔ اس کا نام بخشیش علی تھا اور جیل سے رہا ہونے کے بعد کسی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ان کے آبائی گھر گیا مگر جو خاندان وہاں آباد تھا وہ بخشیش کے نام سے

ناواقف تھے۔ سرور اور عزیز کو ڈھونڈ نکالنے والا طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ میں پولیس سے ملا اور وہ بھی اُس کے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔

میونسپل کمیٹی کے پیدائش و اموات کے رجسٹروں کو کھنگالنا شروع کیا تو مجھے بخشیش کے فوت ہونے کا پتا چلا۔ وہ 1958ء میں فوت ہوگیا تھا لیکن میں کوشش کے باوجود وفات کی وجہ اور اس کی قبر معلوم نہ کر سکا۔ اس کی بیوی کے متعلق بھی کچھ پتا نہ چلا۔ مجھے اس ناکامی پر بہت رنج ہوا۔ بخشیش کو میرے باپ نے ایک دھوکہ دیا تھا اور غالباً وہ حساب صاف کر گیا۔ میری کوششوں کے باوجود مجھے نہیں ملا اور جو بوجھ میں اپنے سر سے اُتارنا چاہتا تھا ایک عذاب بن گیا۔ گٹھری وزنی تھی اور میرا سفر طویل۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نتیجے پر پہنچ گیا اور اپنے دفتر والی عمارت کا نام بدل کر بخشیش ہاؤس رکھ دیا۔ اس طرح وہ مستقلاً میرے کاروبار کا حصہ بن گیا اور اسی نام پر مجھے دنیا کے ہر کونے سے خطوط اور دوسری ڈاک موصول ہونے لگی۔

تینوں فیکٹریاں اپنے باپ، دادا، اور پردادا کے نام پر تبدیل کر دیں۔ اس تبدیلی سے مجھے ایک عرصے تک کافی نقصان ہوا لیکن آہستہ آہستہ میرے پرانے Client واپس آنا شروع ہو گئے۔

یہ سب کچھ تو میں اُن کے لیے کر گزار جن کا دین دار تھا۔

کیا میرا کسی پر کوئی قرض تھا اور اسے کوئی چکائے گا بھی؟

میں ایک دفعہ پھر تنہا ہو گیا تھا۔

رخشندہ اور میری زندگیاں الگ الگ تھیں مگر کسی نہ کسی طرح ہم آپس میں جڑے ہوئے ضرور تھے۔ وہ گھر چھوڑ کر نہیں گئی اور نہ ہی اسے میری دلچسپیوں سے کوئی واسطہ تھا، بس ایک کونے میں بیٹھی موٹی ہوتی رہی اور پھر ایک دن مر گئی۔ پری کے ساتھ دوبارہ ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ میری تنہائی دوبارہ مجھ پر حاوی ہوگئی اور میں اس سے چھٹکارا پانے کے ذرائع سوچنے لگا۔ دوسری شادی کا خیال میرے ذہن میں کئی مرتبہ آیا لیکن میں کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری یہ ذہنی کیفیت شراب نوشی کو ہوا دے سکتی تھی لیکن، یہ نہیں ہوا۔ شراب میری زندگی کا حصہ رہی تھی، عورتوں کی طرح، پری سے ملنے کے بعد مجھے عورتوں سے دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن ان کے قرب میں اب بھی لطف آتا۔ شراب نوشی ترک نہیں کی لیکن کم ضرور کر دی تھی۔ اب میں اسے زندگی بہلانے کے لیے استعمال نہیں کرتا تھا وہ مجھے Inspiration دیتی تھی، شاید پری کو یاد رکھنے کا بہانہ تھی۔

X

''رخشندہ سامپل کولیکشن پوائنٹ'' آہستہ آہستہ تمام شہروں میں کھل رہے تھے۔ تمام یونٹ ایک ہی ڈیزائن کے تھے، کسی شہر میں بھی چلے جائیں، آپ کو جگہ دیکھی نظر آئے گی۔ ہر پوائنٹ پر تین شفٹوں میں کام ہوتا تھا۔ ایک ڈاکٹر، نرس اور ریسپشنسٹ وہاں موجود ہوتے۔ نمونوں کو بہترین لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کروا کے رپورٹیں مریضوں تک مفت پہنچائی جاتیں۔

راولپنڈی میں نیا سنٹر کھل رہا تھا۔ میں کام کی رفتار کا جائزہ لینے وہاں گیا۔ یہ کافی بڑا سنٹر تھا اور جلد از جلد اس کی تکمیل چاہتا تھا چناں چہ سارا دن تعمیر کی جگہ پر گزرا۔ شام میں کافی تھک گیا۔ مجھے کسی نے ایک گھر کا پتا بتایا جہاں تفریح کے لیے میں جا سکتا تھا۔

آدمی کے عورتوں کے ساتھ کئی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں اور یہ عمر کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اس میں تمام رشتے شامل ہیں یہاں تک کہ ماں اور بیٹے کا بھی۔ میری عمر میں محبوبہ نہیں ہوتی صرف ایک وجود ہوتا ہے جسے چھونے کی اہلیت نہیں مگر خواہش کی شدت کا بیان مشکل ہے۔ چناں چہ میں وہاں بات چیت سے لطف اندوز ہونے چلا گیا۔ میرا طریقہ ہے کہ جب بھی اس طرح شام گزارنے جاؤں وقت کی قیمت ادا کرنے کے علاوہ تحفہ بھی لے کر جاتا ہوں۔

کار ایک چھوٹے سے گھر میں داخل ہوئی۔ میں اُتر کر باہر آیا تو پورچ اور تین سیڑھیاں مجھے مانوس لگیں۔ مختصر سا برامدہ بھی جانا پہچانا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک آہ میرے لبوں سے نکل گئی اور جونہی نظر دروازے کی طرف اُٹھی، میرا سانس رک گیا کیوں کہ وہاں پیتل کی چمکتی ہوئی پلیٹ پر

پرستان لکھا تھا۔

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا۔ میرا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ میں کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر یہ ممکن محسوس نہ ہوا اور میں نے دروازے کے ساتھ لگے بٹن کو دبایا۔

ملاقات کا وقت طے پا چکا تھا اور میری آمد متوقع تھی۔ ڈرائیور تحفے کا پیکٹ اُٹھائے میرے پیچھے کھڑا تھا۔ خادمہ نے دروازہ کھول کر ایک نظر مجھے دیکھا اور ایک طرف کو ہٹ گئی۔ میں جونہی اندر داخل ہوا تو ہر چیز واضح ہو گئی۔ سامنے صوفے پر پری بیٹھی تھی۔ اسے کسی کے آنے کا انتظار تھا لیکن یقیناً میرا نہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ پھر رنگت واپس آنا شروع ہوئی تو اس کی آنکھوں نے میرا جائزہ لیا۔ اس وقت میں اسے دیکھے جا رہا تھا اور ایسے لگتا تھا کہ میں کیمرہ بن گیا ہوں۔ وہ آہستہ سے اٹھی، کسی حد تک بے یقینی کی کیفیت میں...... میں خود بھی کچھ ایسی ہی حالت میں تھا...... وہ اُٹھ کر کھڑی ہوئی تو میں اسے مکمل طور پر دیکھ سکا۔ وہ تھوڑی بھاری ہو گئی تھی۔

پری میری طرف بڑھی...... میں جب پہاڑوں سے آیا تھا تو وہ تیزی سے چلتی میری طرف آئی تھی اور ہمارے درمیان اگر میز نہ ہوتا تو یقیناً مجھ سے لپٹ جاتی...... آج ہمارے درمیان میز نہیں تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ چلتی میری طرف آئی...... شاید وہ اب اُتنی جوان نہیں تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر ایک لمحہ کے لیے رکی اور شاید میرے چہرے پر اُسے اپنی جدائی لکھی نظر آئی اور تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس لپٹنے میں ایک عجیب سی شدت تھی۔ وہ میرے ساتھ لپٹی ضرور مگر اس نے مجھے بھینچا نہیں غالباً اس خوف سے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے بازو نیچے لٹک رہے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ قمیص کا سامنے والا حصہ گیلا ہو رہا ہے۔ میرے بازو خود بخود اُٹھے اور پری کے گرد لپٹ گئے۔ میرا چہرہ اس کے بالوں کو چھو رہا تھا۔ مجھے بھی اپنی آنکھوں میں دھندسی محسوس ہوئی...... ہم دونوں ہی رو رہے تھے؟ مجھے یقین نہیں آیا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور پری کو غور سے دیکھا۔

ہماری نظریں ملیں اور وہ روتے ہوئے ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس دیا۔ اس کا قہقہہ پرانا

کنوارا پن لیے تھا۔ وہاں مجھے اچانک اُس کی آنکھوں میں روشنی نظر آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا ڈرائیور کھڑا تھا اور پری اس کے ہاتھ میں تھمے تحفے کو دیکھ چکی تھی۔ مجھے اپنا وجود پیار کے لاوے میں ڈھل کر بہتا ہوا محسوس ہوا...... میں نے اسے پھر ساتھ لگا لیا۔

ہم دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔ اس دفعہ ہمارے آنسو نہیں نکلے۔

پری کے قرب کی روشنی میرے ہر تاریک کونے کو روشن کرنا جانتی تھی۔ میں زندگی میں دوبارہ تنہا ہو گیا تھا۔ اس دفعہ تنہائی کی وجہ مستقبل کا اندھیرا بھی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری پوری ہستی چکنی ہو گئی ہے اور ہر احساس پھسل کر جدا ہو رہا ہے یہاں تک کہ اپنا انجام بھی دسترس سے باہر لگا۔ اب جب پری اس طرح کھڑی تھی کہ اس کا جسم میرے سارے پیکر کو صرف چھو رہا ہے تو اپنے اندر کے کسی کونے سے ہمت اور اعتماد بادل کی طرح اپنی ہستی کی وادیوں میں اُٹھتا محسوس ہوا۔

مجھے کوئی عارضہ تو نہیں تھا لیکن میری ٹانگیں میرا وزن اُٹھانے میں تکلیف محسوس کرتی تھیں۔ میرے اندر یک لخت تبدیلی آ گئی۔ چلتے ہوئے میرے پاؤں ہمیشہ دلدل میں پھنسے محسوس ہوتے تھے، اَب مجھے لگا کہ میں زمین پر کھڑا ہوں۔ میری کیفیت اکثر وہی ہوتی جو پری کو ابرار کے ساتھ اپنے دفتر سے نکلتے وقت دیکھ کر ہوئی تھی اور آج میں خود کو ویسے محسوس کر رہا تھا جیسا ابرار کی شکست کے بعد پُر اعتماد، قدرے بے نیاز اور...... طاقتور۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور ٹھوڑی سے پری کا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سپردگی ہمارے اکٹھے ہونے کی طرح واضح تھی۔ میں نیچے جھکا اور اس کے ماتھے کو چوم کر صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔

”یہ گھر میں نے اُسی گھر کے نقشے سے بنوایا ہے جو آپ نے خرید کر دیا تھا۔“

مجھے اچانک ہر چیز کے ساتھ لگاوٹ محسوس ہوئی۔

مجھے یک دم عبدالمجید کے ساتھ ملاقاتیں یاد آ گئیں۔ پری اور میں اُنہیں جگہوں پر بیٹھے تھے، عبدالمجید والی جگہ قدرتی بات ہے، خالی تھی۔ ایسے محسوس ہوا وہ وہاں موجود ہے، صرف نظر نہیں

آ رہا۔ اُس کے وجود سے کمرہ بھرا ہوا لگا۔ صرف اسے چھو کر دیکھنے کی ضرورت تھی۔ مجھے لگا کہ کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا ہے۔

اُوپر دیکھا تو پری کی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

مجھ پر جن لوگوں کے احسانات تھے وہ میں کسی نہ کسی طرح چکا چکا تھا، وقت ہی بتائے گا کہ میری سوچ صحیح تھی یا نہیں۔ پری میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں عبدالمجید کو بالکل بھول گیا۔ عبدالمجید ایسی سوچ چھوڑ گیا تھا جو میرے اندر زندہ تھی اور جسے میں آگے چلانا بھول گیا۔

لمبی سانس لینے پر پری نے ہٹ کر مجھے دیکھا۔

”تمہیں عبدالمجید کے فوت ہونے کی خبر ہے۔“

”آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“

”اُس وقت تو کچھ خاص نہیں لیکن آج یہ خالی جگہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا ہے۔“

میں نے عبدالمجید کے بیٹھنے کی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہیں کب پتا چلا تھا؟“

”اسی شام!!“

بدگمانی کا کیل اچانک میری سوچ میں کھب گیا۔

پری مجھ سے دور رہی لیکن اس کا ان لوگوں سے رابطہ تھا۔ کیا الیکشن جتانے والی پری کی پریس کانفرنس کی ہدایات اسے وہاں سے ملی تھیں اور پھر مجھے خیال آیا کہ بدرالدین کو یہ خبر اس طرح دی گئی کہ اسے کامیابی کا واحد ذریعہ نظر آئی اور فائدہ مجھے پہنچا...... میں ایک دم ہنسنے لگا۔

”کچھ نہیں......“

میں نے پری کا سر تھپتھپایا۔

”اس کی موت پر تمہارا کیا تاثر تھا؟“

مجھے اچانک بیزاری کا وہی احساس ہونے لگا جو تب ہوا کرتا تھا۔ عبدالمجید اسی طرح

ہمارے درمیان میں موجود تھا۔ عجیب بات تھی کہ ابھی کچھ میں اسے کسی اور طرح یاد کر رہا تھا...... اور آج تین برس پیچھے چلا گیا......!!

”مجھے بھی دکھ ہوا لیکن اس طرح نہیں جس طرح ابھی آپ کو ہوا...... وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔“

پری کچھ دیر رکی۔ وہ میرے کندھے پر ایسے سر ٹکائے بیٹھی تھی کہ میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

”لیکن سب باتوں کے علاوہ وہ ایک نظریاتی آدمی تھا اور اس کے چہرے پر اپنے نظریے کا غرور تھا۔ اُس کی باتوں اور لہجے میں یقین تھا اور یہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار بھی۔“

پھر وہ میری طرف مڑی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور میں اس چمک سے واقف تھا۔ عرصے کے بعد میں اور زندگی اکٹھے تھے...... مجھے محسوس ہوا کہ قبرستان سے نکل آیا ہوں......

”آپ الیکشن لڑنے اور جیتنے کے بعد تھوڑے عرصے میں اپنے لیے ایک مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔ جو آپ نے کیا وہ ہمارے ہاں رائج سیاسی رواج نہیں۔ ایسی ہی عبدالمجید کی سیاسی سوچ تھی اور وہی آپ نے کیا...... دیکھیں......“

پری شاید میری طرح یہ سارے برس خاموش رہی اور بولے جانا ہی اس کا علاج تھا۔

”اس کی ذات میں تضاد دیکھیں۔ وہ دھونسو اور بلیک میلر تھا۔ ہر کام کی قیمت وصول کرنا اور نقصان پہنچانے کو معمولی واقع قرار دینا غیر اہم سی چیزیں تھیں جب کہ سیاست میں بے اُصولی ناقابل معافی جرم۔“

پری کچھ دیر میرا چہرہ پڑھتی رہی اور پھر کاندھے سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ لگا کہ وہ لگاتار مجھے چھوئے جانا چاہتی تھی۔

”تمہیں علم ہے کہ میری بیوی فوت ہو گئی ہے۔“

”مجھے واقعی تکلیف ہوئی۔ ان کی زندگی اور موت، دونوں ہی بہت تکلیف دہ تھیں۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔ آپ کے دکھ میں شریک ہونا میرا فرض تھا لیکن میری مجبوری شاید آپ نہ سمجھیں۔“

گفتگو دراصل خود بخود اس طرف چل پڑی جدھر میں چاہتا تھا۔

''میرے اپنے کافی مسائل تھے، اس گھر کی تعمیر اور کچھ...... دوسرے کام۔''

وہ خاموش ہوگئی۔

میں کچھ دیر اس کے بات شروع کرنے کے انتظار میں رہا۔

''تم بھی چلی آئیں...... میں بہت اکیلا ہوگیا۔ مجھے اپنی تنہائی سے خوف آنے لگا۔ اکیلی ذات اور اتنی بڑی کاروباری مملکت...... مجھے یہ تمام بے کار نظر آیا......''

''ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں یہ سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوگیا۔ تم گوتم بدھ سے واقف ہو۔''

میں نے پوچھا۔

''نہیں!! سدھارتھ کو جانتی ہوں۔''

اُس کی ہنسی میں پرانے بلبلے تھے۔

''مجھے سکون کی تلاش تھی اور سکون مجھ سے گریزاں، چناں چہ، میں کئی دفعہ سب کچھ بانٹنے کا ارادہ کرتا......''

حمیدی

''بانٹا تو نہیں کچھ؟''

پری نے اچانک میری بات کاٹی۔

میں کافی حیران ہوا۔

نفی میں میرا سر ہلتا دیکھ کر وہ واپس اپنی حالت میں چلی گئی۔

''کئی لوگوں کے ہیولے مجھے ڈرانے لگے۔ ان میں تم بھی تھیں...... اتفاق کہ باقی تمام فوت ہو چکے تھے!!''

پری نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

اپنے محسوسات اور اعمال بتاتے مجھے کافی وقت لگا۔

XII

''مجھے اس وقت بتانے میں کوئی جھجک تو نہیں تھی لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا۔ دراصل میں حاملہ تھی۔''

مجھے یقین نہیں آیا۔

پری اس طرح میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی اور عورت ہے۔ پری تو پاکیزگی کی علامت تھی...... شاید پری ابھی بھی پاکیزہ ہو اور صرف زہرہ جبیں حاملہ ہوئی تھی۔

پری اس طرح میرے ساتھ لگی بیٹھی تھی مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی اور عورت ہے۔ پری تو پاکیزگی کی علامت تھی...... شاید پری ابھی بھی پاکیزہ ہو اور صرف زہرہ جبیں حاملہ ہوئی تھی۔

مجھے لگا کہ میں اس سے تھوڑا دور ہو کے بیٹھ گیا ہوں۔ پری نے اس مختصر ترین فاصلے کو پر کرنے کی کوشش نہ کی۔ خیالات پانی کے ریلے کی طرح مختلف سمتوں سے آرہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ پری اور زہرہ جبیں تو دراصل ایک ہیں جب کہ میرے کئی چہرے ہیں۔ معلوم ہی نہ ہو سکا اور کوئی دوسرا معظم علی خاں، پری کو زہرہ جبیں بنا آیا، صرف یہی نہیں بلکہ خود بھی وہیں سونے لگا۔

پری یا زہرہ جبیں یا دونوں...... حاملہ ہوگئیں ہیں تو قصور معظم علی خاں کا نہیں ہے۔

میں پری کے ساتھ لگ کے بیٹھ گیا۔

''آپ کو بتا کر آئی تھی کہ میرے پیچھے نہیں آنا کیوں کہ مجھے خود کو کھوجنا ہے...... دراصل میں یہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنا حمل جاری رکھنا ہے یا اسقاط میرے لیے ضروری ہے......!''

مجھے اس رات پری کا تھکا ہوا چہرہ اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے یاد آ گئے۔

‘‘میرا فیصلہ اسقاط کے خلاف تھا۔ میں ماں بننے کے تکلیف دہ عمل کی لذت سے گزری ......آج میں ایک ماں ہوں!’’

‘‘کیا پیدا ہوا’’

بے اختیار میرے منہ سے نکلا بالکل جیسے محمود کی دکان پر میں اپنے بوڑھے ہونے کی نفی کر چکا تھا۔

پری بے نیازی سے اُٹھی اور وقار سے چلتی کونے میں رکھی میز تک گئی۔ اُوپر والی دراز سے ایک کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے دوبارہ ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اشتیاق سے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا جو میونسپل کارپوریشن کا پیدائشی سرٹیفکیٹ تھا۔ پری نے ایک بیٹی کو جنم دیا، جس کے باپ کا نام معظم علی خاں اور دادا کا نام میرے باپ کا تھا۔ مجھے پری کے جائیداد کی تقسیم والا ردِ عمل یاد آیا۔ پہلی دفعہ پری کا تمام تعلق اس کی بیٹی کی پیدائش کے ساتھ منسلک نظر آیا۔ وہ اکلاپا جسے میں پری کے ساتھ مل کر قبضے میں کر چکا تھا، مجھے فاتح لگا......میرا کوئی نہیں تھا، ہر کسی نے مجھے دھوکہ دیا اور اس کے بدلے میں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا رہا......لیکن پری کے ساتھ میں نے بھی دھوکہ کیا تھا، وہ ایک مغرور عورت تھی اور میں نے اسے......اچانک مجھے خود سے نفرت ہو گئی لیکن پری کو میں اس طرح بدلہ نہیں لینے دوں گا۔

میری اولاد نہیں تھی لیکن اپنی چھوٹی سی سلطنت مجھے اتنی ہی عزیز تھی۔

‘‘یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ میری اولاد ہے۔’’

مجھے اپنے لہجے کی سرد مہری پہ حیرت ہوئی......اپنے اندر کا سرمایہ دار مجھے اچھا نہیں لگا۔

‘‘آپ الیکشن میں مصروف تھے اور میں سائرہ کو دنیا میں لانے کے عمل میں۔’’

جب پری اپنی کھوج میں نکلی تو اگر اس وقت کو حمل کا ابتدائی زمانہ کہا جائے تو تاریخیں وہی بنتیں تھیں، مگر یہ تو ایک سادہ نوعیت کی جمع تفریق تھی۔

‘‘الیکشن کے دنوں میں کئی بچے پیدا ہوئے تھے۔’’

‘‘دیکھیں......! میں عورت ہوں۔ عورت کھیتی ہے جس میں سے بیج اُگتے ہیں۔ میں کھیتی ہوں...... درست......لیکن عورت بھی ہوں۔ میرے کچھ جذبات ہیں جو صرف آپ کے لیے وقف رہے ہیں۔’’

پری مجھے تذبذب کا شکار کر گئی۔ میں طے نہ کر سکا کہ اس کی بات سے کیا نتیجہ نکالوں۔

‘‘جو آپ نے کیا مجھے اسی کی اُمید تھی یا شاید اس کی حق دار تھی۔ میرا رویہ بعض اوقات غیر مصالحانہ ہو جاتا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ کسی آدمی کو کس طرح قبول کیا جائے۔ بے شمار پیشہ وارانہ ترکیبیں میں سیکھ گئی۔ آپ کے ساتھ نہیں......میرے کھیت سے وہی اُگا جو آُپ نے بویا......’’

مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ پری نے تمام گفتگو دھیمے اور میٹھے لہجے میں کی۔ وہ کسی مرحلے پر تہذیب کے دائرے سے باہر نہ ہوئی۔ میں اس اُلجھن میں پھنس گیا کہ یہ عمر کی دانشمندی تھی یا پیشہ وارانہ مصلحت!!

‘‘میرے پیٹ سے بیٹا بھی پیدا ہو سکتا تھا مگر کھیت سے وہی اُگا جو آپ نے بویا......’’

پری نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

ہنسی کے لہجے میں مجھے ریا کے بادلوں کے بجائے سچ کی دھوپ کھلتی محسوس ہوئی۔

شعوری طور پر میں اس حقیقت کو نظر انداز کر گیا۔

شاید یہ میری شکست کا آغاز تھا یا بڑھاپے کی مکاری......میں فیصلہ نہ کر سکا۔

پری اسی وقار کے ساتھ اُٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کی گود میں سفید فراک پہنے تین سال کی بچی تھی جسے اس نے بیٹھنے کے بعد اپنے پاس کھڑا کر دیا۔

بچی سر جھکائے کھڑی کن اکھیوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

مجھے اس بچی پر ترس آیا۔ وہ ایک میدان تھی جس میں پری بظاہر اپنی مکاری اور میں خاندان کو صاف رکھنے کی جنگ لڑ رہا تھا۔ ہمارے درمیان اس معرکے میں وہ معصوم جان......اس نے پھر میری طرف دیکھا......!!

میں نے ٹھوڑی سے اس کے سر کو تھوڑا اُوپر کیا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں آنکھیں

کھولنے کے انتظار میں رہا۔ جب اس نے انکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے یقین نہ آیا۔ میرے سامنے عزیز، میرا باپ یا میں خود کھڑا تھا۔ میرا دل اچانک سائرہ کو گود میں اُٹھانے کو چاہا لیکن میں خود کو روک گیا۔

پری میرا چہرہ پڑھ گئی تھی۔

’’ایک اور بات آپ کو بتا دوں...... جو یہ چاہتی ہے کر جاتی ہے۔ اس میں آپ والی تمام تر خباثت موجود ہے۔‘‘

اچانک سائرہ مجھے اپنی لگی اور میں اکیلا نہیں تھا......

پری نے دوسری اننگز میں بھی مجھے کلین بولڈ کر دیا۔!!!